رضا علی عابدی

اُردو کا حال

Muhammad Husnain Siyalvi
0305-6406067
Sidrah Tahir
0334-0120123
Muhammad Saqib Riyaz
0344-7227224

اُردو کا حال

رضا علی عابدی

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Raza Ali A'badi
Urdu Ka Haal/ Raza Ali A'badi.-
Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2005.
142pp.
1. Urdu Literature. I. Title.

2005
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

ISBN 969-35-1725-3

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com
Chowk Urdu Bazar Lahore. Pakistan. Phone 7667970

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

فہرست

اردو کا حال

رشید احمد صدیقی کیسے بھلے آدمی تھے۔ انہوں نے لکھا تھا: "زبان کے علاوہ اردو بہت کچھ اور بھی ہے۔ جیسے ایک قیمتی ورثہ، ایک قابلِ قدر روایت، ایک نادر آرٹ، ایک مسحور کن نغمہ، قابلِ فخر کارنامہ، کوئی پیمانِ وفا یا اس طرح کی کتنی اور باتیں جو محسوس ہوتی ہیں لیکن بیان نہیں ہو پاتیں۔"

میری کیا مجال کہ جو باتیں رشید احمد صدیقی جیسے بلا کے ذہین شخص سے بیان نہ ہو پائیں انہیں میں بیان کرنے کی کوشش کروں۔ اس خیال سے میں نے قلم اٹھانے کا ارادہ بھی کیا تو خود ہی ہار مان لی۔ اردو زبان کے روشن یا تاریک گوشوں میں جھانک کر دیکھنا چاہا تو بہت کچھ دیکھا مگر جب اسے بیان کرنے کی ٹھانی تو زبان اور قلم دونوں دو قدم بھی نہ چل سکے۔

تب میں نے فیصلہ کیا کہ اپنی عمر میں اردو کو میں نے جس حال میں دیکھا اور برتا، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اردو نے مجھے جس حال میں پہنچایا کہ جہاں سرفرازی ہی سرفرازی ہے، اپنی یادداشت کے ذخیرے سے اس کے موتی چن چن کر نکالوں اور بیان کروں۔ جانتا ہوں کہ جو

کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ سب کچھ بیان کرنے سے قاصر ہوں لیکن ان سطروں کے بیچ اگر زبان کی آب وتاب کی جھلک بھی نظر آ جائے تو خود کو کامیاب جانوں گا۔

اس کتاب کو میرے مضامین کا مجموعہ سمجھا جائے تو اچھا ہو جو میری یادداشتوں کا ایک تابناک گوشہ ہیں۔

میں جو کچھ ہوں، میں ہی جانتا ہوں لیکن میرے اس ہونے میں اردو زبان کو جو دخل ہے، چاہتا ہوں کے اس کا احوال دوسرے بھی جانیں۔

اس کتاب کا نام 'اردو کا حال' یوں پڑا ہے کہ میں زبان کو جس حال میں پاتا ہوں وہ حال بھی کہتا جاؤں اور دوسری وجہ اس عنوان کی یہ بھی ہے کہ ماضی کے برسوں سے نکل کر اردو نے جس حال میں قدم رکھا ہے اس کا گواہ بنوں۔

ایک کتاب میں کیا اچھی بات پڑھی کہ جو کچھ ہوتا ہے، اُس سے پہلے کچھ ہو چکا ہوتا ہے۔ اس سیدھے سادے فقرے میں جو حقیقت پنہاں ہے اس پر غور کیا جائے تو ختم ہونے کا نام نہ لے۔ آج ہم جہاں ہیں، کہیں چلے تھے تب یہاں پہنچے ہیں۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہم چل رہے ہیں اور ہمارا ماضی ساتھ لگا لگا چل رہا ہے۔ اپنا آج سمجھنے کے لئے اپنے کل سے کٹ کر نہیں رہا جا سکتا۔

اس لئے میں نے زبان کے حال پر تفصیل سے روشنی ڈالنا چاہا ہے اور ماضی کے جھروکوں سے جو کچھ دیکھتا آیا ہوں، بیان کرتا چلا ہوں تاکہ جو حال کہوں اس کی شہادت بھی فراہم ہوتی جائے۔ یوں سمجھئے کہ اردو کا حال بیان کرتے ہوئے میں نے خود کو ماضی سے یوں بھی نہیں کاٹا کہ مورخین کا یہ قول رہ رہ کر یاد آتا ہے کہ ہمارا ماضی ہی ہمارا مستقبل ہے۔

اردو کا حال کہتے ہوئے حضرت علیؓ کا یہ قول بھی پیشِ نظر رہا ہے کہ 'جو کچھ ہو چکا ہے اُس کے ذریعے اُس کا پتہ لگاؤ جو ہونے والا ہے'۔ اپنے حال کی مدد سے اپنے مستقبل کا قیاس کرنا ہمارے بزرگوں کا شعار تھا چنانچہ عام لوگ اب تک کہتے ہیں کہ ہمارے بزرگ غیب کا حال جانتے

تھے۔

مختصر سی بات یہ ہے کہ اردو کا حال بیان کر کے چاہتا ہوں کہ میرا قاری آنے والے حال کا قیاس کرے اور کیا اچھا ہو کہ عام لوگ کہیں کہ اسے غیب کا حال معلوم ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ 'اردو کا حال' کے عنوان سے ان مضامین کی تکمیل کے بعد 'اردو کا مستقبل' کے عنوان سے کچھ لکھنے کی ضرورت رہے گی کیونکہ غور کرنے والوں کے لئے ان صفحات میں آنے والے دنوں کے نشان موجود ہیں۔

کتاب میں زبان سے وابستہ بہت سے سوال اٹھائے گئے ہیں۔ زبان کے بدلنے کا عمل اور دہن کے بگڑنے کا اندیشہ آج کا بڑا اور اہم مسئلہ ہے۔ اردو کو معاشرے اور معیشت میں کیا مقام حاصل ہے اور زبان سیاست کی تپش کی زد میں ہے کہ نہیں۔ یہ کس کی زبان ہے، اس کا والی کون ہے اور وارث کون۔ ہندوستان میں اردو پر کیا بیت رہی ہے، پاکستان میں اردو پر کیا نہیں بیت رہی ہے، کوریا سے لے کر کینیڈا اور ماسکو سے لے کے ماریشس تک اس زبان کو کس نے سینے سے لگایا ہے اور اس سینے سے لگانے والے کی مدد کو پہنچا جائے یا اس کو اسی کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

یہ بظاہر بلند آہنگ سوال ہیں جن پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے آہستگی سے تمام ممکن جواب فراہم کر دیئے ہیں۔ ممکن ہے کچھ سوال رہ گئے ہوں یا کچھ جواب تشنہ ہوں۔ اگر ان پر گفتگو کا سلسلہ چل نکلے تو اس کتاب کو نصیبہ ور جانوں گا۔

اردو کہاں کہاں پہنچی اور کن حالات میں جی رہی ہے اور یہ کس کے لئے روٹی روزی کی زبان ہے اور کس کے لئے نہیں، یہ معاملہ بھی اٹھایا گیا ہے۔ اردو کی تعلیم نے کیسے کیسے پاپڑ بیلے اور اس کی تدریس کیسے کیسے ہاتھوں میں جا پہنچی ہے۔ اردو کی ترویج اور قبولیت کے لئے کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونا چاہئے، یہ بھی بڑا موضوع ہے۔

اردو کی طباعت اور اشاعت پر کس زمانے میں کیا بیتی اور آج اس پر کیا گزر رہی ہے،

نثر کا کیا حال ہے، نظم کو اتنا عروج کیوں، فیصلے کہاں ہو رہے ہیں اور عمل درآمد کیونکر، کتاب سے دل لگانے والی نسل کدھر گئی اور اسے پلکوں پر جگہ دینے والے کتنے لوگ بچے ہیں۔ آج کی اس کتاب میں یہ سارے احوال یک جا ہو گئے ہیں۔

کتاب میں میرا مشاہدہ ہے، میری تحقیق شامل ہے اور میرا تجزیہ بھی ہے جسے میری رائے کہا جا سکتا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس میں ایک طرف جھکاؤ بھی ہے اور اردو کے حق میں جانب داری بھی۔ اس صورت حال کو اختلافی کہا جائے تو مجھے کوئی اختلاف نہ ہوگا۔

یہ زبان مجھ سے نہیں مگر میں اس زبان سے ضرور ہوں۔ اس نے میرا بھلا چاہا، میں اس کا بھلا چاہتا ہوں۔ یہ کوئی ادلے بدلے کا بندوبست نہیں، یہ میرے آنگن میں بکھری ہوئی روشنی ہے اور میرے چمن میں پھیلی ہوئی خوشبو ہے، یہ میرے سینے میں دھڑکتی ہوئی زندگی کی علامت ہے، یہ میرے وجود پر برستی ہوئی ٹھنڈک اور میرے ماتھے پر رکھی ہوئی ماں کی ہتھیلی ہے۔ جس طرح اس میں عربی، فارسی، ہندی، پنجابی، سندھی اور گوجری کی آمیزش ہے بالکل اسی طرح یہ زبان راحت، چین، سکون، آرام اور آسائش کا آمیزہ ہے۔

بس یہ ہے کہ یہ زبان کھلی ہوئی بانہیں مانگتی ہے۔ وہ کھلی ہوں تو یہ آپ ہی سینے سے لگ جاتی ہے۔

یہی اردو کا حال ہے، یہی ماضی اور مجھے یقین ہے، یہی مستقبل۔

رضا علی عابدی

۲۵ دسمبر ۲۰۰۴ء

لندن

وہ ایک بات جو طے ہے

سر جادو ناتھ سرکار نے اورنگ زیب عالمگیر کی سوانح میں ایک دلچسپ روایت نقل کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب نے حکم جاری کیا کہ جن سرکاروں یا صوبوں کے نام چھوٹی ہ پر ختم ہوتے ہیں، آج کے بعد ان سب کے نام الف پر ختم کیے جائیں۔ یعنی آگرہ نہیں، آگرا۔ بنگالہ نہیں، بنگالا اور اڑیسہ نہیں، اڑیسا۔

پھر کیا ہوا۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ لوگوں نے ہ کی جگہ کہیں بھی الف نہیں لگایا۔ پھر ادھر ہمارے دور میں ایک بار پھر فرمان تو جاری نہیں ہوا البتہ یہ تحریک چلی کہ ہندوستانی لفظوں کو لوگ عربی یا فارسی الفاظ کی طرح چھوٹی ہ پر ختم کرتے ہیں۔ بری بات ہے۔ انہیں الف پر ختم ہونا چاہیے۔ پیسہ نہیں، پیسا۔ روپیہ نہیں، روپیا۔ مہینہ نہیں، مہینا۔

نتیجہ کیا نکلا، سب جانتے ہیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنی کتابوں میں اصرار کیا کہ جانِ عالم نے طوطا نہیں، توتا خریدا تھا۔ لوگوں نے صاف کہہ دیا کہ جو لطف طوطے میں ہے، وہ توتے میں کہاں کہ طوطے میں تو جو نچ کی مشابہت غضب کی ہے۔

طالب علم کی جمع طلبائے علم ہونی چاہئے۔ سر سید کے رفقا نے ’طالب علموں‘ لکھا اور ’طالب علموں‘ ہی کہا۔ آج تک یہی لکھا جا رہا ہے، یہی کہا جا رہا ہے۔

اس بحث سے نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ زبان پر پابندیاں نہیں لگائی جا سکتیں اور یہ کہ وقت کے ساتھ زبان کو برتنے والے اس میں ردو بدل کرتے رہتے ہیں اور اگر وہ کسی لفظ یا محاورے کی شکل بدلتے ہیں تو یہ ان کا حق ہے اور زبان میں اس طرح کی تبدیلیوں کو اکثر سند مانا گیا ہے۔

ہمارے ایک بزرگ کہا کرتے تھے کہ مشہور کہاوت ’نہ نو من تیل ہوگا، نہ رادھا ناچے گی‘ یوں نہیں تھی بلکہ اصل میں یوں تھی۔ ’نہ من ہوگا نہ رادھا ناچے گی‘۔ بات سمجھ میں آتی ہے۔ اسی طرح وہ کہتے تھے کہ اصل کہاوت تھی۔ ’یہ منہ اور منصور کی دار‘۔ جسے لوگوں نے مسور کی دال بنا دیا۔ یہ بات بھی قرین قیاس ہے۔

جوش صاحب کے بارے میں روایت ہے کہ میر انیس کے قلم سے نکلی ہوئی ہر عبارت کو سند مانتے تھے۔ ایک بار کسی محفل میں اصرار کر رہے تھے کہ ناؤ کے لئے زبر کے ساتھ کَشتی صحیح ہے۔ زیر کے ساتھ کِشتی غلط ہے۔ اس پر ماجد علی مرحوم نے کہا کہ میر انیس نے اپنے کسی شعر میں زیر کے ساتھ کِشتی باندھا ہے۔ جوش صاحب نے ماننے سے انکار کر دیا اور للکارا کہ انیس کے کلام میں یہ لفظ نکال کر دکھاؤ۔ جو لوگ ماجد علی مرحوم کو جانتے ہیں وہ اس روایت کو بھی مان لیں گے کہ انہوں نے انیس کا وہ شعر ڈھونڈ نکالا جس میں انہوں نے بہشتی کے وزن پر لفظ کِشتی باندھا تھا۔

روایت ہے کہ جوش صاحب کو یہ شعر دکھایا گیا تو خفا ہو کر بولے کہ میر صاحب نے بھی جھک ماری۔

غنیمت ہے کہ کِشتی کا تلفظ عام نہ ہوا اور ہماری کَشتی ثابت و سالم رہی۔

تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو میں اگر بگاڑ ہوتا نظر آئے تو ہم صبر کے علاوہ اَور کیا کر سکتے ہیں۔ تحریر میں، تقریر میں، کتابوں اور اخباروں میں، ریڈیو اور ٹیلی وژن پر اگر کہیں زبان کی خرابی لگتی نظر آئے تو کیا اس کا کوئی اُپائے ہو سکتا ہے یا ہندوستانی فلمیں دیکھنے والوں کا وطیرہ اختیار کر لینے ہی میں عافیت ہے۔

(سچ تو یہ ہے کہ ادھر بعض ہندوستانی فلموں میں اتنی صاف اردو بولی جانے لگی ہے کہ کبھی کبھی دل سے دعائے خیر نکلتی ہے۔)

کہیں کسی کی ولادت کو سو سال پورے ہوئے تو پاکستان میں کہا گیا کہ ان کی 'ہنڈرڈوین' سال گرہ منائی گئی۔ اس کے راوی ہمارے بے حد مستند بزرگ شان الحق حقی ہیں۔

پاکستان ہی میں ٹیلی وژن والوں نے اچھا بھلا لفظ 'ناظرین' ترک کرکے 'ویورز' کہنا شروع کر دیا اور وہ بھی اُس لہجے میں جس میں جولا ہے کو ویورز کہا جاتا ہے۔ جب ہم نے جا بجا شکایت کی تو انہوں نے ویورز کی جگہ فرینڈز کہنا شروع کر دیا، اور وہ بھی اس شان سے کہ 'السلام علیکم ناظرین' نہیں بلکہ 'ہائے فرینڈز'۔

حیرت ہوتی ہے کہ اس طرح کی اردو بولنے والوں کو ہماری ہائے نہیں لگی۔

لیکن اردو کی اصلاح کوسنے کاٹنے سے کبھی ہوئی ہے جواب ہوگی۔ تو اپنا سوال دہراتا ہوں کہ خاموش بیٹھ کر تماشا دیکھا جائے یا اصلاح کی کوئی تدبیر نکالی جائے۔

کہیں کوئی ایسی تحریک تو چل ہی سکتی ہے کہ ابلاغ عامہ کے ان ذرائع پر نگاہ رکھی جائے اور جہاں کہیں زبان کے حق میں فروگزاشت ہو وہاں اسی ابلاغ عامہ کے ذریعے اس کی نشان دہی کی جائے۔ اس سے میری یہ مراد ہر گز نہیں کہ خدانخواستہ تضحیک کی جائے بلکہ بات صرف اتنی سی ہے کہ کوئی تو منہ کھولے تاکہ زبان کی اصلاح ہو۔ کہیں سے کوئی آواز اٹھے جو تلفظ کو درست کرے۔ کچھ نہ کچھ روک تھام کی صورت ہو تاکہ ادارے نہیں تو افراد ہی اپنی اصلاح کر لیں۔ وقتاً فوقتاً غلطیوں کی فہرستیں شائع کی جائیں۔ اور کچھ نہیں تو ہمارے دوست ادریس صدیقی کی حکمت اختیار کی جائے۔

ادریس صدیقی اب تو خدا جانے کہاں ہیں، جب وہ ریڈیو سے وابستہ تھے تو انہوں نے بڑے کمال کی ایک چھوٹی سی کتاب لکھی تھی جس کا عنوان تھا: یہ مسائلِ تلفظ۔ اس میں انہوں نے نہ صرف تلفظ کے اصولوں پر بحث کی تھی بلکہ اُن لفظوں کی فہرست بھی ترتیب دے دی تھی جن کا تلفظ اکثر غلط کیا جاتا ہے۔ ستر اسّی صفحوں کی کتاب تھی جو غالباً دوستوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی۔ اس

طرح کی ارزاں کتابیں ترتیب دی جائیں۔ اپنے املا اور تلفظ کو درست کرنے کے خواہش مند ذوق وشوق سے مطالعہ کریں گے۔ اس بیان میں میرا اتنا دعویٰ نہیں، جتنی میری تمنا کارفرما ہے۔

رواج پاتے پاتے کسی لفظ کا بدل جانا اساتذہ کے نزدیک بھی قابل ملامت نہیں۔ غلط العام کے نام پر بہت سے الفاظ کی نت نئی شکلیں قبول کرلی جاتی ہیں اور اس میں کوئی ایسی برائی بھی نہیں۔

مثال کے طور پر جس کو ہم بوتل کہتے ہیں، اہل عرب اسے شیشہ کہتے ہیں۔ اہل دکن بھی، جن کے ہاں حضرموت کے عربوں نے پڑاؤ ڈالا تھا، بوتل کو شیشہ ہی کہتے ہیں۔ ہم بھی ضرور کہتے ہوں گے کیونکہ اسی مناسبت سے ہم نے چھوٹی بوتل کے لئے اپنا لفظ شیشی بنالیا۔ اس کے بعد ہم نے شیشہ ترک کردیا اور زبان کو بوتل میں اتارلیا۔ لفظ کا یوں بدل جانا ہر طرح سے قابل قبول ہے۔ لفظ موسم کے نیچے زیر لگا کرتا تھا۔ ہم نے زبر لگا کر موسَم بنادیا۔ بولی ٹھولی میں اس طرح کا زیر و بم یقیناً قابل قبول ہے۔

لفظ وَرثہ کے اوپر زبر ہوا کرتا تھا۔ ہم نے زیر لگالیا۔ اور تو اور، ہندی لفظ 'لوک' کو عربی لفظ 'ورثہ' سے ملا کر لوک ورثہ بنالیا۔ اچھا کیا۔

جائز صورتوں کو قبول کرلینے میں بھی عافیت ہے لیکن اس طرح کی اخباری سرخی جی کو دکھاتی ہے کہ: پاک فضائیہ کے سربراہ پلین کریش میں ہلاک۔ یا فلاں اور فلاں کے درمیان ون ٹو ون مذاکرات۔ یا فلاں صاحب نے فلاں سوال پر یوٹرن لے لیا۔

زبان بڑی غریب شے ہے۔ اس بات کی دلیل میں کہا جاسکتا ہے کہ بے چاری کا کوئی بڑا مطالبہ نہیں۔ بس ایک ذرا سی چیز مانگتی ہے۔ اپنا احترام اور اپنی تقدیس۔

جو کرے اس کا بھی بھلا۔

نہیں۔ بس اُسی کا بھلا۔

قومی زبان اور رابطے کی زبان کا تنازعہ نیا نہیں۔

بلوچستان کے ایک سرکردہ رہنما کسی بات پر خفا ہوگئے اور جیسے پرانے زمانے میں ناراض شہزادے اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ رہتے تھے، انہوں نے اعلان کردیا کہ آج کے بعد وہ اردو نہیں بولیں گے۔ عقل حیران ہے کہ جھگڑا سارا مرکز کے حکمرانوں سے ہوا اور بجلی گری اردو زبان پر، وہی اردو کہ مرکز کے حکمرانوں کی افسر شاہی آج تک فائلوں پر یہ زبان لکھنے سے انکاری ہے۔ اس کے بعد وہ رہنما صاحب یا تو بلوچی بولتے تھے یا انگریزی۔ خدا جانے یہ روٹھا روٹھی کتنے عرصے چلی۔

کام بظاہر مشکل ہے لیکن زبان کو اس کشاکش سے بچانے کے لئے کچھ ہونا چاہئے۔ جب میں کہتا ہوں کہ زبان اپنا احترام مانگتی ہے تو میرا اشارہ صرف اردو کی طرف نہیں ہوتا۔ اس اصول کا اطلاق ہر زبان پر ہوتا ہے۔ ہر زبان مقدس ہوا کرتی ہے۔ خود اللہ کہتا ہے کہ رنگ، روپ اور نسل کی طرح بھانت بھانت کی بولیاں اس کی اختراع ہیں۔ یہی بات ہے تو ساری ہی زبانیں احترام کی حق دار ٹھہریں۔

جن کو ہم علاقائی یا صوبائی یا لوک زبانیں کہتے ہیں، ان کے فروغ اور ترویج کے لئے کام اس طرح ہونا چاہئے کہ وہ ہوتا ہوا نظر آئے۔ ہر زبان کے علاقے میں اس کی تعلیم کا موثر اہتمام ہونا چاہئے تاکہ نئی نسل اس سے اچھی طرح واقف ہو، اس کا چلن عام ہو اور ایک سے زیادہ زبانیں پہلو بہ پہلو پھولیں پھلیں۔

زبانیں اپنا مقام خود بناتی ہیں۔ زبان لوگ نہیں بولتے، ضرورت ان سے بلواتی ہے۔ برطانیہ میں اپنی طرف کے جن بچوں کی ماں انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکتی، اس کے بچے تمام عمر ماں کی بولی روانی سے بولتے ہیں۔

فرانس میں لوگ جانتے ہوئے بھی انگریزی نہیں بولتے تھے۔ سوویت یونین والے انگریزی کا ایک لفظ نہیں جانتے تھے۔ چین کی سرزمین سے انگریزی کا گزر بھی نہ تھا۔ اب ہر جگہ انگریزی ہی انگریزی ہے۔

دور کیوں جائیے۔ خود ہمارے برصغیر میں جن لوگوں کو انگریزی نہیں آتی ان کا جینا

محال ہے، اور جو انگریزی میں رواں ہیں ان کو برطانیہ اور امریکہ والے ان کے گھر آ کر ملازمتیں پیش کرتے ہیں۔ برطانیہ میں ریل گاڑیوں کی آمدورفت جاننے کے لئے فون کیجئے تو جواب دینے والا بنگلور میں فون اٹھاتا ہے۔ امریکی ڈاکٹر مقامی اسپتال کو خط لکھنے کے لئے ٹیلی فون پر خط کا املا لکھواتا ہے جو نئی دہلی میں بیٹھا ہوا نوجوان لکھتا ہے۔ سارے چین میں لوگ انگریزی سیکھنے کے اس قدر مشتاق ہیں کہ انگریزی کلاسوں میں تل دھرنے کو جگہ نہیں۔

برطانیہ میں ایک بہت بڑی بیمہ کمپنی نے اپنے ہزاروں ملازموں کو فارغ کر کے ہندوستان میں ہزاروں جوان بھرتی کر لئے ہیں جو اگرچہ چوتھائی تنخواہ پر کام کرتے ہیں لیکن مقامی کرنسی میں ان کے گھروں میں ہُن برسنے لگا ہے۔

اس میں کمال انگریزی کا نہیں، ضرورت کا ہے۔

اتنی بڑی زبان کو ساری دنیا رابطے کی زبان کہتی ہے اور کوئی برا نہیں مانتا۔

انگریزی کی خاطر کوئی کسی پر جبر نہیں کر رہا ہے۔ نہ حکم نامے اور فرمان جاری ہو رہے ہیں۔ نہ پارلیمانوں میں آستینیں چڑھائی گئی ہیں۔ نہ قومی غیرت اور حمیت کا سوال اٹھ رہا ہے۔ میں نے تو آج تک کسی انگریز کو بھی دعویٰ کرتے نہیں سنا کہ انگریزی اس کی قومی زبان ہے۔

وقت اپنے فیصلے خود کرتا آیا ہے اور آئندہ بھی کرتا رہے گا۔

اور کچھ ہو یا نہ ہو، یہ بات طے ہے۔

سارے جہاں میں

میں نے ہندوستان اور پاکستان کے بڑے دور افتادہ علاقے دیکھے ہیں۔ مگر ایک عجیب بات دیکھی ۔ میں جہاں کہیں بھی پہنچا، اردو مجھ سے بہت پہلے پہنچ چکی تھی۔

ہمالیہ کے پچھواڑے لدّاخ میں ایک بڑے نالے جیسے دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا میں وہاں پہنچا جس کے آگے چینی تبت ہے۔ میں دریا کے کنارے ایک گاؤں میں پہنچا جس کا نام اُپشی تھا۔ مجھے دیکھ کر گاؤں والے میرے گرد جمع ہو گئے۔ جی چاہا ان سے باتیں کروں مگر خیال آیا کہ خدا جانے کون سی زبان بولتے ہوں گے۔ مگر میرے سلام علیکم کہنے کی دیر تھی کہ اب جو وہ بولے تو بالکل میری ہی جیسی اردو بولے۔ ان میں سے کسی نے مدرسے کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ لکھنا پڑھنا نام کو بھی نہیں آتا مگر اردو اس روانی سے بول رہے تھے جیسے نیچے میدانوں میں عمر گزار کر آئے ہوں۔ نیچے کے وہی علاقے جن کی طرف سے ان غریبوں کا دل صاف نہیں تھا۔

میں ان سے کہہ رہا تھا کہ آپ کے بڑے شہر لیہ میں تو بڑی ترقی ہوئی ہے۔ پیسہ آ گیا ہے، اچھے مکان بن گئے ہیں۔ اچھے کپڑے پہننے لگے ہیں۔ آپ کے گاؤں کا کیا حال ہے؟

اُن میں سے ایک بولا" ہم لوگوں کا گاؤں چھوٹا ہے۔ اِسے کون دیکھے گا۔ اوپر سے کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔ جب کوئی چیز آتی ہے بس نیچے ہی ختم ہو جاتی ہے۔ ہم لوگوں تک تو چار آنے بھی نہیں پہنچتے۔ ایسے تو یہ لوگ بہت پبلک پبلک کرتے ہیں مگر ہمیں پوچھنے والا کوئی نہیں۔"

اس گفتگو میں اردو روزمرہ اور محاورہ پوری آن بان سے کارفرما تھا۔ بات میں سلاست تھی اور روانی تھی۔ لفظوں کی نشست و برخاست زبان دانی کے تمام اصولوں پر پوری اترتی تھی اور محسوس ہوتا تھا کہ چین کی سرحد پر رہنے والے یہ ان پڑھ دیہاتی نہیں بول رہے ہیں، اردو کا اعجاز بول رہا ہے۔

اور جب چلتے چلتے میں اسکردو پہنچا تو وہاں دوسری ہی دنیا آباد دیکھی۔ کسی زمانے میں یہاں کی زبان لدّاخی تھی اور رسم الخط تبتی تھا۔ لوگ اُسے بچانے کی بہت کوشش کرتے ہیں مگر اور دو زبان معاشرت میں یوں گھل مل گئی ہے کہ علاقے میں پیدا ہونے والی شیریں خوبانی اور شہتوت بھی مقابلتاً پھیکے پڑ گئے ہوں گے۔

بلتستان کے ایک بزرگ دانش ور وزیر غلام مہدی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ایسے لوگ نصیبوں ہی سے ملتے ہیں۔ ان کی باتیں دریائے سندھ میں بہتے ہوئے چاندی جیسے پانی میں دھلی ہوئی تھیں۔

ان سے بلتستان کی ثقافتی اقدار کی گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے کہا کہ آپ کا علاقہ باقی برصغیر سے اتنی دور، اتنا الگ تھلگ ہے کہ اصولاً اس کی زبان اور خصوصاً لب ولہجہ جدا ہونا چاہئے تھا مگر یہاں لوگ صاف، سلیس اور رواں اردو بول رہے ہیں اور ان کے لب ولہجے پر نہ پنجاب کے اثرات تھے، نہ کشمیر کے اور نہ ہزارہ کے۔ اس کا کیا راز ہے؟

وزیر غلام مہدی صاحب نے کہا۔" بات یہ ہے کہ ہم ہر آواز کا تلفظ ادا کر سکتے ہیں کیونکہ ہمارے لب ولہجے اور گفتگو میں ایسی فطری خوبی ہے کہ اردو ہو یا عربی فارسی، ہم آسانی سے بول لیتے ہیں، چنانچہ ایک بڑے آدمی نے کہا تھا کہ اردو پھل ہو سکتی ہے تو بلتستان میں، کیونکہ بلتستان کی تہذیب وہی ہے جو اردو کی تہذیب ہے۔ ہر زبان کے پیچھے ایک تہذیب ہوتی ہے اور

اردو کی تہذیب میں بلتی کی طرح بہت سی ثقافتوں کا اشتراک ہے چنانچہ اُس بڑے آدمی نے کہا تھا کہ بلتی لوگ آسانی اور روانی سے اردو بول سکیں گے۔ اب اپنے کانوں سے سن کر آپ بھی تصدیق کر رہے ہیں۔"

وزیر غلام مہدی صاحب کی یہ باتیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ کیا اردو واقعی دکن، لکھنو اور دہلی کی زبان ہے؟ کیا یہ درباروں کی زبان ہے؟ کیا یہ غیروں کی، مسافروں کی اور اجنبیوں کی زبان ہے؟ پھر یہ کیسا چمتکار ہے کہ ہمالیہ کے اُس پار جہاں مانسون گھٹائیں بھی نہیں پہنچ پاتیں، وہاں اردو کی جھڑی لگی ہے؟

سمجھ میں نہیں آتا کہ جس گھر کے آنگن میں اردو نام کی سانولی سلونی سی لڑکی گنگناتی، سر بکھیرتی پھرتی ہو، اور جہاں اس کی پائل کے چھوٹے چھوٹے گھنگرو بجتے ہوں تو فضا میں چاندی گھل جاتی ہو، اُس گھر والے یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ "ہم جب بھی اردو میں لکھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اپنے مکان میں نہیں، کرایے کے مکان میں بیٹھے ہیں۔"

اردو کے بارے میں اکثر بہت دل چسپ بحثیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اردو برصغیر کے کس علاقے میں پیدا ہوئی۔ اور دوسرے یہ کہ یہ زبان کتنی پرانی ہے۔

اس دوسرے سوال کے جواب میں کسی نے کیا اچھی بات کہی کہ مسلمان فاتحین کے آنے سے پہلے بھی تو برصغیر کے لوگ کوئی زبان بولتے ہوں گے۔ وہی اپنے رخ پر غازہ لگا کر سنور گئی ہے۔

اردو کس علاقے میں پیدا ہوئی؟ ہزارہ میں، سندھ میں، پنجاب میں، ہریانہ میں، گجرات میں، دکن میں یا میرٹھ اور دلی کے درمیان والے علاقے میں۔

میں تو اسے اردو کی خوش نصیبی جانتا ہوں کہ برصغیر کے اتنے بہت سے علاقے خود کو اردو کی جائے ولادت مانتے ہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں وہ جو دلائل دیتے ہیں وہ دل کو لگتے ہیں، ذہن کو قائل بھی کرتے ہیں۔

میں اس بارے میں کوئی انکشاف کرنے کی اپنے میں جرات نہیں پاتا، صرف اتنی سی بات کہنا چاہتا ہوں کہ اردو زبان کے الفاظ کہیں سے بھی آئے ہوں۔ اس کے سارے اسم اور تمام صفتیں کتنی ہی درآمد شدہ ہوں، اس کے verbs، اس کے فعل چند ایک کو چھوڑ کر سارے کے سارے مقامی ہیں۔ جو فعل مقامی نہیں ان میں بھی 'نا' لگا کر انہیں ہندوستانی بنایا گیا ہے۔

تحقیق کرنے والے کہیں دور نہ جائیں۔ اردو میں جتنے بھی فعل رائج ہیں: آنا، جانا، اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا، کھانا، پینا، ہنسنا، رونا، ان سب کی چھان بین کر کے دیکھ لیں کے یہ کس خطے اور کس علاقے میں رائج تھے، کہاں ان کی بنیاد تھی اور کہاں انہوں نے یہ شکل اختیار کی۔ جس علاقے پر تحقیق کرنے والوں کا اتفاق ہو جائے، اُس کو اردو کا گہوارہ سمجھنا چاہئے۔

میں مانتا ہوں کے یہ کوئی اعلیٰ علمی دلیل نہیں اور اس سے میرا مبتدی ہونا صاف جھلکتا ہے مگر اس طرح سوچنے میں کسی کا کچھ جاتا بھی تو نہیں۔ ذرا سی زحمت تو کریں زبان کے اس پہلو پر۔ شاید کوئی دل چسپ نتیجہ نکل آئے۔

ایک اور سوال یہ بھی زیرِ بحث آتا ہے کہ زبان کو اردو کا نام کب ملا۔ لفظ اردو کب سے رائج ہے۔ کیا یہ ترکی زبان سے آیا ہے۔ کیا جہاں سے لفظ horde نکلا ہے وہیں سے اردو کا چلن ہوا ہے؟ چنگیز خان کے علاقے میں، جہاں رہائشی خیمے کو آج بھی گھر کہتے ہیں، ہر نئی بیوی کو رہنے کا جو ٹھکانا فراہم کیا جاتا تھا اُسے اردو کہا جاتا تھا۔

یہ صحیح ہے کہ پہلے پہل اردو کو ہندی کہا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کے مسلمان فاتحین شمالی دڑوں سے اتر کر جس سرزمین پر آئے تھے اسے ہند کہتے تھے۔ موجودہ اٹک کے پاس جس جگہ سے وہ دریائے سندھ پار کرتے تھے اس کا نام او ہند پڑ گیا تھا۔ وہیں لوگ انگلی کے اشارے سے دوسرا کنارہ دکھاتے ہوئے کہا کرتے ہوں گے کہ وہ ہند ہے۔ اسی ہند کی مناسبت سے یہاں کے باشندوں کو کسی مذہب کے امتیاز کے بغیر ہندو کہا گیا ہوگا اور اسی نسبت سے یہاں کی زبان ہندی کہلائی، چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ لفظ 'ہندی' بذاتِ خود ہندی زبان کا لفظ نہیں ہے۔

غالب کے زمانے تک تو اس زبان کو ہندی اور ہندوی کہا گیا۔ تاریخی شہر ملتان میں

قدیم صوفی شاعروں کے کلام کے ابتدائی نسخے میں نے دیکھے ہیں، ان میں ان کے کلام کو پنجابی یا سرائیکی نہیں بلکہ ہندی لکھا گیا ہے۔ گویا اُس مخصوص دور میں ہندوستان کی بولیوں کو ہندی کہا جانا بعید از قیاس نہیں۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ انگریزوں نے تفرقہ ڈالنے کے لئے اردو اور ہندی میں تخصیص کی اور اردو کو 'ہندوستانی' کا نام دیا جو آگے چل کر اردو ہو گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو پر اسی وقت مسلمانوں کی زبان ہونے کا ٹھپہ لگ گیا ہوگا اور کچھ یہی صورت ہندی کے ساتھ پیش آئی ہوگی لہٰذا ایک درمیانی صورت نکالنے کے لئے 'ہندوستانی' سے کام چلایا گیا۔ فیلن کی ڈکشنری اس کا ثبوت ہے۔

جب اردو رسم الخط میں ہندی آوازیں کثرت سے شامل ہونے لگیں تو نئی وضع کے حروف ڈھالنے کا مرحلہ آیا۔ جس کے جو جی میں آیا وہ کر گزرا۔ ان ہی انگریزوں نے رسم الخط کو سلیقہ دیا۔ اس میں تو چھوٹی ی اور بڑی ے میں فرق نہیں کرتے تھے۔ ٹ، ڑ، ڈ، ابھی میرے بچپن تک یوں لکھے جاتے تھے کہ ایک چھوٹی سے ط بنانے کے بجائے کوئی دو نقطے ڈالتا تھا، کوئی چار اور کوئی چھوٹی سے افقی لکیر کھینچ دیتا تھا۔

انگریزوں ہی نے اردو حروف کا ٹائپ تراشا اور طباعت شروع کی۔ انہوں نے دوچشمی ھ لگا کر ہندی آواز کے حروف بنائے ورنہ بھائی اور بہائی میں کوئی فرق نہ تھا۔

ایک وقت تو ایسا آیا، اور وہ پرانے قلمی نسخے میں نے دیکھے ہیں جن میں ہمارے بزرگ نقطوں سے بے نیاز ہو چلے تھے اور بے نقط لکھتے تھے۔ یہ بھی ہوا کہ لفظ 'اور' لکھتے تو آخر میں رے بنانے کی زحمت ختم کئے ڈالتے تھے۔

عوام میں تفرقہ اور رخنہ ڈالنے والوں نے ہمارے اس رسم الخط کو ضابطہ دیا۔ اسے سائنسی بنیادوں پر استوار کیا اور پھر اسے رائج بھی کیا۔ انہوں نے لاکھ چاہا کہ اردو ٹائپ رواج پائے اور اس غرض سے جیسے بھی بنا نستعلیق ٹائپ وضع کیا مگر ہم لوگوں نے نقشے چھاپنے والی پتھر کی سلوں پر کتابت شروع کر دی اور ٹائپ کو رائج نہ ہونے دیا۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ اردو رسم الخط سیکھنا مشکل ہے وہ زیادہ دور نہیں، سو برس پرانی اردو کتابیں اٹھا کر دیکھیں اور موازنہ کریں تو اندازہ ہو کہ اردو جس قدر بولنے اور سننے میں مہذب زبان ہے، اسی قدر اس کا رسم الخط بھی تہذیب یافتہ ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں گھر گھر خوش نویسی کا چلن اٹھ گیا ورنہ اس کی تحریر میں لوگ موتی ٹانکا کرتے تھے، موتی۔

چپ کی تحریر

اپنے دوست عبید صدیقی کے ساتھ کار میں بیٹھا میں دتی شہر کے نواح کی طرف جا رہا تھا۔عبید نے کار کے ریڈیو پر کوئی مقامی اسٹیشن لگا دیا۔

پہلا ہی فقرہ سن کر میں اچھل پڑا اور میں نے کہا کہ مبارک ہو، دہلی میں کوئی اردو اسٹیشن کھل گیا۔عبید بولے کہ نہیں، یہ حالات حاضرہ نشر کرنے والا ہندی ریڈیو اسٹشن ہے۔

میں نے کہا۔"مگر اس پر تو اردو بولی جا رہی ہے۔"

کہنے لگے۔"اب یہی ہو رہا ہے۔"

میں نے کہا کہ یہ تو سماچار کو خبریں کہہ رہا ہے۔

عبید بولے۔"جی ہاں۔"

بات تو حیران ہونے کی تھی سو میں ہوا۔مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں جب ہندوستان میں زبان سے اردو کے لفظ چن چن کر نکالے جا رہے تھے یہاں تک کہ ہندی کے جو لفظ اردو میں

آ گئے تھے ان تک کو زبان نکالا مل رہا تھا۔ اچھی بھلی رات کو راتری بنا دیا گیا۔ اس سے کوئی ایسا فرق تو نہیں پڑا بس ذرا تاریکی بڑھ گئی۔ غرض یہ کہ سارے سامنے کے حرف نکال دیئے گئے اور ان کی جگہ بالکل اجنبی اور قطعی نامانوس لفظ یا تو تراشے گئے یا سنسکرت سے مستعار لے کر وضع کئے گئے۔

اُس وقت آل انڈیا ریڈیو سے جو خبریں نشر ہوتی تھیں وہ شاید خود آل انڈیا ریڈیو کے عملے کی سمجھ میں بھی نہیں آتی ہوں گی۔ وہ غالباً نئی نئی آزادی کے بعد شدت سے ابھرنے والی قوم پرستی تھی جو زبان کا حلیہ بدلے ڈال رہی تھی ورنہ چند روز پہلے بھی تو یہی آل انڈیا ریڈیو تھا جہاں سے دن میں کم سے کم تین بار خبریں نشر ہوتی تھیں۔ مجھے تو اس زمانے کا مخصوص اعلان تک یاد ہے جس میں کہا جاتا تھا۔ "یہ آل انڈیا ریڈیو ہے۔ اب آپ خبریں سنئے جو دلّی، بمبئی، لکھنؤ، لاہور اور پشاور سے ایک ساتھ سنائی جا رہی ہیں"۔ اس وقت تک تو اردو ہندی کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ ایک ہی زبان تھی جو سب کے لئے قابلِ قبول تھی۔ اس عام فہم زبان کے لئے آل انڈیا ریڈیو نے ایک معیار مقرر کرنے کی غرض سے اپنی 'اسٹائل بک' ترتیب دی تھی۔ خبروں کے سارے لفظ اور تمام اصطلاحیں اسی کتاب کے مطابق ہوا کرتی تھیں۔ نہ کسی کو کوئی شکایت تھی نہ شکوہ۔

مجھے معلوم ہے کہ ریڈیو کی اس اسٹائل بک کی ایک جلد کراچی میں ہمدرد فاؤنڈیشن کے کتابوں کے ذخیرے میں موجود ہے۔ وہ بھی دیکھنے کی چیز ہوگی۔

ہر چند کہ ہندوستان کو اور اس کے رہنماؤں کو اپنے سیکولر ہونے کا دعویٰ تھا اور بعض رہنما عام فہم زبان میں تقریریں اور گفتگو کرتے تھے لیکن میڈیا کے معاملے میں انہوں نے اپنے ملک کو ہندی سرزمین قرار دے کر ۱۵ اگست کی صبح ہی سے اردو اور اس سے ملتے جلتے لب و لہجے کو کسی پناہ گزین اسپیشل میں بٹھا کر چلتا کیا۔

مجھے یاد ہے، میں میرٹھ کی تحصیل ہاپوڑ میں مقیم تھا جہاں میرے بہنوئی تحصیل دار تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یومِ آزادی کی چھٹیاں ختم ہوتے ہی جو عملہ کام پر واپس آیا اس نے اپنی دستاویزیں ہندی میں لکھنی شروع کر دیں۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ابھی کچھ روز پہلے تک ساری کارروائی اردو میں، بلکہ فارسی زدہ اردو میں ہوا کرتی تھی۔

جہاں تک آل انڈیا ریڈیو کی زبان کا تعلق ہے، اسے زیادہ عرصہ نہیں ہوا، مجھے دلّی کی نشر گاہ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں بڑے پھاٹک سے داخل ہوتے ہی سامنے ایک تختہ ء سیاہ لگا دیکھا جس پر لکھا تھا ''آج کی ہندی اصطلاح''۔ اس تختہ سیاہ پر ہر روز ایک انگریزی لفظ اور اس کے نیچے اس کا ہندی ترجمہ چاک سے لکھا جاتا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ آتا جاتا ہر شخص ہر روز کم سے کم ایک ہندی لفظ سیکھ لے۔

یہ تختہ سیاہ اتنے عرصے سے بھرا جا رہا تھا کہ پرانے حروف مٹاتے مٹاتے اس کی سیاہی بھی مٹتی جا رہی تھی اور مٹائے جانے والے حروف کی چاک کا سفوف تختہ سیاہ کے نیچے تہ بہ تہ جمتا چلا جا رہا تھا۔

ہر ایک جانتا ہے کہ آزادی کے فوراً بعد ہندی اصطلاحیں وضع کرنے کے لئے ایک مرکزی ادارہ قائم کر دیا گیا تھا جو اپنے طور پر بھی نئے نئے لفظ تراش رہا تھا اور افراد اور اداروں کو دعوت تھی کہ انہیں انگریزی کا کوئی لفظ ستائے یا پریشان کرے اور ڈکشنری اس کا اُپائے نہ کر سکے تو ادارہ مدد کے لئے حاضر ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں ریڈیو اور اسی مناسبت سے اخباروں میں وہ ہندی رواج پا گئی جو وہاں کوئی چاہتا تھا کہ رواج پائے۔

مجھے یہ بھی یاد ہے کہ اُس وقت ہندوستان کے وزیر تعلیم شری سمپورن آنند تھے۔ میں نے نوعمری میں انہیں دیکھا بھی تھا۔ ہمارے اسکول میں آئے تھے۔ باتوں سے بھلے لگتے تھے لیکن ہندی کے معاملے میں سخت گیر نکلے۔ پتہ چلا کہ انہوں نے دیوناگری ٹائپ اور رسم الخط سے وہ حروف خارج کرا دیئے جو عربی اور فارسی آوازیں نکالتے تھے۔ حروف کیا تھے، مروجہ حرفوں کے نیچے بندی لگا کر، مثال کے طور پر، جا کو زا، پھا کو فا، گھا کو غا اور کھا کو خا بنا دیا گیا تھا۔ یہ ہو نہ ہو قدرت ہی کی کوئی ستم ظریفی رہی ہوگی کہ ہندی میں شا پہلے سے موجود تھا۔

فاضل وزیر تعلیم نے ہندی ٹائپ بنانے والوں کو ہدایت کردی کہ حروف کے نیچے بندی لگانا فی الفور ختم کر دیں۔ ان کا دلچسپ استدلال یہ تھا کہ لفظ غزل جب ہندی میں آئے تو بے شک گجل کہلائے اور جب تک خون کی ہندی ایجاد نہیں ہو جاتی، اہل ہند اسے کھون کہہ لیں، کہ اسی

میں ہندی کی شان ہے۔

یہ استدلال پیش کرنے والوں کو کیا خبر تھی کہ ہندی کی بندی نوچ لینے سے اس کی پیشانی کیسی اجڑی اجڑی سی ہو جائے گی اور دنیا کے اس نہایت مکمل اور سائنسی رسم الخط کا 'کھون' ہو جائے گا۔ میں اس رویے کا مخالف نہیں، آپ کی زبان ہے، جو چاہے کیجئے لیکن یہ تو سوچئے کہ ایک بے مثال اور لاجواب خوبی کیسی بے دردی سے تلف ہو جائے گی۔ اس رسم الخط میں قریب قریب ہر آواز کو ادا کرنے کی جو حیرت انگیز استعداد تھی اسے جان بوجھ کر ایک حکم کے ذریعے بھاری پتھر کے نیچے دبا دیا گیا تا کہ ہری گاس خود ہی پیلی پڑے اور آپ ہی مر جائے۔

آخر وزیر تعلیم مر گئے۔ اور بھی بہت سے بندی مخالف عناصر رخصت ہوئے۔ پھر وقت بدلا اور ہندی کو برتنے والے باشعور لوگوں نے بندیاں بحال کر دیں لیکن اب بھی کہیں رائج ہیں اور کہیں نہیں۔

وقت کا بدلنا ایک روز بھی نہ تھما۔ ہوا یہ کہ ہندوستان میں دو ہندیاں پہلو بہ پہلو چلیں۔ ایک وہ ہندی جس پر حکومت کا بس چلتا تھا، جس میں کوئی کاروباری منافع یا گھاٹا نہیں تھا اور مقابلے پر کوئی نجی ریڈیو یا ٹیلی وژن نہیں تھا۔ چنانچہ دوردرشن اور آکاش وانی سے اردو بس اتنی دیر چلتی تھی جتنی دیر کوئی فلمی گانا نشر ہوتا تھا۔ وہ چاہے غالب کی غزل ہو، ریکارڈ پر زبان ہندی ہی لکھی ہوتی تھی۔

اس وقت سرکار میں شاید کوئی یہ ٹھان کر بیٹھا تھا کہ لوگوں کے کانوں میں یہی گاڑھی ہندی اتاری جائے۔ دس سال، بیس سال، تیس سال بعد کبھی تو سڑکوں پر گلیوں میں، آنگن اور دالانوں میں یہی آکاش وانی والی ہندی بولی جائے گی، اسی کا عام رواج ہو جائے گا، اسی کا چلن ہوگا اور پورا ہندوستان وہی ہندی بولنے لگے گا جس میں اردو، فارسی اور عربی کا ایک ذرا سا شائبہ بھی نہیں ہوگا۔

اس ہندی کے پہلو میں ایک دوسری ہندی چلی جا رہی تھی۔ وہ تھی، فلموں، گیتوں، گانوں اور تھیٹر کی ہندی اور تھیٹر تو گاؤں گاؤں اور نکڑ نکڑ تک جا پہنچا تھا۔ پھر فلموں میں کروڑوں کا

سرمایہ لگ رہا تھا جس کی وصولی ضروری تھی۔اس کا حال آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کے ہتھیار بومرینگ کے بالکل برعکس تھا جو نشانے پر بیٹھے تو وہیں رہ جاتا ہے ورنہ ہوا میں اڑتا ہوا لوٹ آتا ہے۔فلموں میں لگنے والا بھاری سرمایہ نشانے پر بیٹھے تو نہ صرف خود واپس آتا ہے بلکہ ساتھ منافع بھی لاتا ہے۔اور نشانے پر نہ بیٹھے تو وہیں کہیں راہ ہی میں غرق دریا ہو جاتا ہے۔

فلم والوں کو ایسی زبان درکار تھی جو لق و دق ہندوستان کے ہر علاقے میں سمجھ لی جائے، اس سے لطف اٹھایا جائے اور لوگ اس پر اپنا پیسہ صرف کرنے کے لئے تیار ہوں۔انہوں نے اپنے لئے اس ہندی کو چنا جو ہر گلی ہر کوچے کی بولی تھی۔ ہماری طرف اسے اردو کہتے ہیں۔ پہلے تو لوگ اس بولی والی فلمیں دیکھنے کے لئے زحمت کر کے سنیما گھر جاتے تھے۔پھر ویڈیو اور کیبل ٹیلی وژن انقلاب بن کر آ پہنچے۔اس طرح یہ سیدھی سادی، سہل اور سلیس ہندی عام گھروں، دکانوں، دفتروں، ہوٹلوں اور بازاروں میں پہنچنے لگی۔اس زبان اور لب ولہجے پر نہ کہیں کوئی اعتراض ہوا اور نہ کسی نے احتجاج کیا۔

میں ۲۰۰۴ء کے شروع میں ہندوستان میں تھا اور پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہند اور اہل ہند کی علاقائی زبانوں کو چھوڑ کر اگر کوئی زبان ہے تو وہی ہندی جس میں کھانے کو کھانا اور پانی کو پانی کہتے ہیں۔سڑکوں پر چلتے لوگ، بازاروں میں گھومتے خریدار اور ان سے لین دین کرتے دکان دار، گھروں میں مصروف گفتگو لوگ، ٹیلی فون پر تبادلہ خیال کرنے والے فریق، وکیل، جج، ڈاکٹر، استاد اور ماسٹر سب وہی ہندی بولتے ہیں جسے میرے دل نے ہر بار اردو کہا۔

سب سے بڑا انقلاب ہندوستان کے نجی ریڈیو اور ٹیلی وژن کے راستے آیا ہے۔لوگ روانی سے بات کرتے ہیں اور بیچ بیچ میں عربی فارسی کے لفظ مسلسل آتے جاتے ہیں۔ابھی ایک روز ہماچل پردیش کے مسائل پر بات ہو رہی تھی اور وہاں کے عام لوگ کہہ رہے تھے کہ پہاڑی نالوں میں لوگ اتنا کوڑا کرکٹ پھینکنے لگے ہیں کہ ان نالوں نے اپنے رخ بدل لئے ہیں۔ مجھے لفظ رخ پر اتنی حیرت نہیں ہوئی جتنی بالکل صاف 'خ' کی ادائیگی پر ہوئی۔ ورنہ ابھی کچھ روز کی بات ہے کہ پاکستان کی ایک ٹیلی وژن چینل پر ناظرین کو 'فرینڈز' کہنے والی ایک خاتون ملک کے ایک

نوجوان گلوکار کو انٹرویو کر رہی تھیں۔ گلوکار کا نام 'فخر' تھا اور خاتون کا 'خ' صاف نہ تھا۔

لندن میں ہمارے ایک ہندی خواں دوست ہیں، بہت اچھی کہانیاں لکھتے ہیں۔ انہوں نے ہندی میں ایک کہانی لکھی جس کا نام، فرض کیجئے، ''جن گننا'' تھا۔ (اس کا تلفظ لکھنا ناممکن ہے، ہرن کے بعد ایک 'ڑ' لگا کر اور ڈنڑ کے وزن پر پڑھئے، کامیابی ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ اس پر زیادہ وقت اور ذہن کھپانا مناسب نہیں)۔ ہاں تو انہوں نے یہ کہانی لکھی۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے اسی کہانی کو اسٹیج ڈرامے کی شکل میں ڈھالا اور ڈرامے کا نام رکھا ''مردم شماری''۔

یہ لفظ مجھے یوں بھی یاد رہا کہ پرانے دنوں کی بات ہے، بی بی سی کی اردو، ہندی اور بنگالی سروس کے نیوز ریڈر ادارے کے نیوز روم میں ایک ہی میز کے گرد بیٹھ کر اپنے اپنے خبر نامے ترجمہ کیا کرتے تھے۔ ایک روز خبروں میں استعمال ہونے والے ایک انگریزی لفظ نے ہندی مترجم کو ستایا اور اس نے اردو مترجم سے پوچھا کہ اردو میں اس لفظ کا کیا ترجمہ ہے۔ اس نے بتا دیا کہ اردو میں اسے مردم شماری کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندی والوں کی اس سے تشفی نہیں ہوئی۔ ایسے موقعوں پر بنگالی والے ان کے بہت کام آتے ہیں، اس کی وجہ یہی ہوگی کہ بنگالی میں بھی بہت سے لفظ سنسکرت سے قریب ہیں۔ اب ہندی مترجم نے یہ سوچ کر کہ کام آسان ہو جائے گا، بنگالی مترجم سے census کا بنگالی ترجمہ پوچھا۔ جواب ملا 'آدم شماری'۔

اب تو خیر سے ہندی والے عربی فارسی لفظ قبول کرنے لگے ہیں لیکن کہیں کہیں ان کے معنوں میں دلچسپ تبدیلیاں کر دیتے ہیں۔ مثلاً لفظ خیمہ ہندی میں آ کر بقول شخصے پر لطف روپ دھار گیا ہے۔ اگر آپ کہنا چاہیں کہ آپ کمیونسٹوں کے کیمپ کو چھوڑ کر نیشنلسٹوں سے جا ملے ہیں تو کہیں گے کہ یہ خیمہ چھوڑ کر مخالف خیمے میں چلے گئے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی کو اپنی بیٹی کے بیاہ کی فکر ہے تو کہا جائے گا کہ وہ اپنی بیٹی کے بیاہ کے فراق میں ہے۔ اسی طرح کسی تباہی کے بعد امدادی کام ہو تو اسے راحت کا کام کہیں گے اور امدادی کارکنوں کو راحت کار اور اسے مناسبت سے راحت کاریہ کا لفظ بنا لیا ہے۔ بالکل یوں جیسے اب ہم جس چیز کو بوتل کہتے ہیں کبھی عربوں کی طرح شیشہ کہا کرتے ہوں گے۔ رفتہ رفتہ یہ لفظ بوتل ہو گیا لیکن چھوٹی بوتل کو ہم اب بھی شیشی کہتے ہیں،

یہ ترکیب بھی ہم نے اپنی سہولت کی خاطر ڈھال لی ہے ورنہ عربی میں ایسا کوئی لفظ نہیں۔

ہندوستان والوں کو ایک بات کے پورے نمبر دینے ہوں گے اور وہ یہ کہ سلیس اردو پوری طرح سمجھتے ہیں۔ اس میں بھی شاید فلموں ہی کا دخل ہے۔

دہلی میں اردو مرثئے کے موضوع پر ایک سیمینار ہو رہا تھا، اسی دوران شہر کی ایک ٹیلیوژن چینل نے، جس کا بی جے پی سے قریبی تعلق بتایا جاتا ہے، سیمینار کے تین شرکا کو اپنے ایک گھنٹے کے پروگرام میں گفتگو کے لئے بلایا۔ اس کے لئے کینیڈا سے ڈاکٹر تقی عابدی کو، لاہور سے پروفیسر مشکور حسین یاد کو اور لندن سے مجھے چنا گیا۔ ہم تینوں اسٹوڈیو میں داخل ہو رہے تھے کہ دلّی کے صاف آسمان پر تیسری محرم کا چاند نظر آیا۔ ایک گھنٹے کے پروگرام میں آدھے گھنٹے محرم کی بات ہوئی اور یہ گفتگو ہوئی کہ حق اور باطل کی جنگ کب، کیسے اور کیوں لڑی جاتی ہے اور شہادت کا اصل تصور کیا ہے۔ اس دوران ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں میر انیس کے مرثئے کے کچھ بند پڑھے۔ پروگرام کے دوران ناظرین کے فون آئے (جو مسلم نہ تھے) اور انہوں نے کہا کہ محرم کی بات کبھی کسی نے اس طرح نہیں سمجھائی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ امام حسین نے اپنے گھرانے کی جانوں کی قربانی دے کر حق کا پرچم بلند کیا۔

پروگرام کے باقی نصف گھنٹے میں اردو زبان کی بات ہوئی۔ میں نے شروع ہی میں پروگرام کے نگراں کو دعوت دی کہ شروع سے آخر تک صرف اردو بولوں کا اور جہاں کہیں میرا ایک بھی لفظ آپ کی سمجھ میں نہ آئے تو مجھے ٹوک دیجئے گا۔ پروگرام کے خاتمے تک یہ ہوا کہ ٹوکنا تو رہا ایک طرف، پروگرام کے پیش کار صاحب بھی اچھی خاصی سلیس اردو بولنے لگے۔

ناظرین نے اس مرتبہ بھی ٹیلی فون کیا اور اکثر نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ زبان کانوں کو بھلی لگتی ہے۔ اور جب میں نے کہا کہ ایک خیال یہ ہے کہ اردو زبان دہلی اور میرٹھ کے درمیانی علاقے سے شروع ہوئی تھی تو پروگرام کے پیش کار نے دہلی اور میرٹھ کے درمیانی علاقے کے ناظرین کو باقاعدہ مبارک باد دی کہ لیجئے، آج کی اچھی خبر یہ ہے کہ اردو آپ کے علاقے کی بولی ہے۔

یہی میں بھی سننا چاہتا تھا۔

اسی شام اِس پروگرام سے پہلے دلّی کی بستی نظام الدین میں اہل اردو کا ایک جلسہ ہوا۔ کتنے ہی سرکردہ ادیب، شاعر، علما اور بزرگ تشریف لائے تھے۔ سیمینار کے مندوبین کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی۔ میری باری آئی تو میں نے کہا کہ زبان کو نام خواہ کچھ بھی دیا جائے، اردو اب ہندوستان کے عام لوگوں کو زبان بنتی جارہی ہے اور اگر اس عمل میں کوئی کمی رہ گئی ہے تو اہل اردو اسے آسانی سے پورا کر سکتے ہیں، انہیں چاہئے کہ آسان، سہل، شستہ اور سلیس اردو لکھیں اور بولیں۔ وہ دیکھیں گے کہ اہل ہند اسی زبان کو اختیار کرلیں گے۔

میں تو یہ واقعہ ہر ایک کو سناتا ہوں کہ جتنی بار ہندوستان گیا اور ملک کے طول وعرض کا دورہ کرتے ہوئے جہاں بھی اردو بولا، مقامی باشندوں نے ہر بار یہی کہا کہ آپ بہت سندر ہندی بولتے ہیں۔

اس کا سب سے دل چسپ قصہ اردو کے استاد ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز کے ساتھ پیش آیا جو وہ خود سناتے ہیں۔ ایک مرتبہ جنوبی ہند گئے اور غالباً مدراس کے علاقے میں کہیں کسی ہوٹل میں ٹھہرے۔ صبح اٹھ کر انہیں تمام انگلستان والوں کی طرح چائے کی خواہش ہوئی اور بیرے کو بلا کر اس سے اردو میں کہا کہ بیرا صاحب، کیا آپ ہمارے لئے گرم چائے لا سکتے ہیں۔ یہ سن کر بیرا کچھ زیادہ محظوظ نہیں ہوا اور انگریزی میں بولا کہ سر ہمیں ہندی نہیں آتی۔ اس پر ڈیوڈ صاحب نے کہا کہ ارے بیرا صاحب، یہ ہندی نہیں ہے، یہ اردو ہے۔ یہ سنتے ہی بیرا اچھل اٹھا اور اردو میں بولا۔ "اچھا اچھا، یہ اردو ہے۔ اردو تو ہمیں بھی پسند ہے، ہم غزل بھی سنتے ہیں۔"

اب یہ کہنا مشکل ہے کہ ہندی کو جب سنسکرت کے سمندر میں غوطہ دیا جارہا تھا تو اس کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما تھا۔ کیا یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ اردو دراصل پاکستان کی اور مسلمانوں کی زبان ہے اس لئے ہندی کا حلیہ ایسا بنا دیا جائے کہ اس میں اردو کی جھلک تک نہ آنے پائے۔ لیکن آج جب کہ ٹیلی وژن اور ریڈیو نے چہار جانب یلغار کی ہے، باہر کے لفظ اٹھانے سے نہ ہندی بچ سکے گی اور نہ اردو کی نجات ممکن ہے۔ جس روز بی بی سی کی اردو سروس کی ایک اناؤنسر نے یہ الفاظ

کہے کہ فلاں جگہ کشمیر کے مدّے کو لے کر ایک کانفرنس بلائی جارہی ہے، میں نے تو اسی روز صبر کر لیا تھا۔ اب تو روز کا قصہ ہے کہ اردو میں ہندی اور ہندوستانی ترکیبیں بے محابہ چلی آرہی ہیں۔ یہی بات ہندوستانی رسم ورواج کی ہے کہ ایک روز کراچی میں ایک شادی کی بہت بڑی دعوت کے دوران لاؤڈ اسپیکر پر اعلان ہوا کہ باہر لان پر کسی کا منگل سوتر پڑا ملا ہے، جن خاتون کا ہو آ کر لے جائیں۔ ایک بار جماعت میں شوہر کا مونث پوچھا گیا۔ بچوں نے جھٹ جواب دیا 'پتنی'۔ ایک صاحب زادے کے والد کا انتقال ہوا۔ گھر والوں سے بولے کہ اب ان کے کریا کرم کا بندوبست کیا جائے۔

سرحد پار بھی پاکستان کے ٹیلی وژن نے اپنے اثرات چھوڑے ہیں۔ بلکہ ہوا یہ ہے کہ ہندوستانی خواتین نے پاکستانی طرز کی اور پاکستانی خواتین نے ہندوستانی طرز کی شلواریں پہننی شروع کردی ہیں۔ مجھے اگر جج بنایا جائے تو کہوں گا کہ ہندوستانی خواتین فائدے میں رہیں۔ خیر، یہ تو اب ہونا ہے اور ہو کر رہے گا۔

ایک بات اور یاد آئی۔ ایک بار بی بی سی میں کہیں سے کسی سامع کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ اپنی ہندی سروس والوں سے کہئے کہ اگر وہ آسان ہندی بولیں تو سب کی سمجھ میں آجائے گی اور ان کے پروگرام زیادہ مقبول ہوں گے۔ میں نے اس وقت کے ہندی سروس کے نگراں سے کہا کہ لوگ کہتے ہیں آپ اپنے پروگرام میں آسان ہندی بولا کیجئے۔ کہنے لگے کہ ہندی کو آسان کیا گیا تو وہ اردو ہو جائے گی۔

میرا خیال ہے کہ ہندوستان والوں نے ہندی آسان کردی ہے جس پر ہمیشہ نہیں، اور میں دوبارہ کہوں گا، ہمیشہ نہیں، کبھی کبھی اردو کا گمان گزرتا ہے۔ اب اگر وہ اپنی زبان کو ہندی کہتے ہیں تو شوق سے کہیں۔ ہمارے بزرگ بھی تو اپنی زبان کو ہندی یا ہندوی کہا کرتے تھے۔

اس بارے میں مجھے دل چسپ تجربہ دلّی کے کتابوں کے قومی میلے کو دیکھ کر ہوا۔ پاکستان میں جو میلہء اسپاں و مویشیاں ہوتا ہے، یہ اس سے بھی بڑا تھا۔ کتابوں کے سینکڑوں اسٹالوں میں لاکھوں کتابیں آراستہ تھیں۔ ظاہر ہے میں لپک کر اردو کتابوں کے اسٹالوں کی طرف

گیا۔ خدا بہشتی زیور اور قصص الانبیاء جیسی کتابوں کو جیتا رکھے، ان کی وجہ سے ہندوستان میں اردو کتابوں کی اشاعت ابھی تک جاری ہے۔ قیامت کا منظر اور مرنے کے بعد کیا ہوگا، ایسی کتابیں نہ ہوتیں تو ہم اپنی زندگی ہی میں دیکھ لیتے کہ کسی زبان پر جب قیامت ٹوٹ پڑتی ہے تو اس کے مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے۔

ہندوستان میں اردو ناشروں کی اس قدامت پسندی کا یہ فائدہ ضرور ہے کہ اسماعیل میرٹھی کے قاعدے آج تک چھپتے ہیں اور بکتے ہی ہوں گے تبھی چھپتے ہیں۔ پاکستان میں کسی نے ان کو مشرف بہ اسلام کر کے ایک بار چھاپا تھا، دوسری بار توبہ کر لی۔

دلّی کے میلے میں پاکستان کے چند ایک ناشروں نے اپنے اسٹال آراستہ کئے تھے اور اپنے ہاں کی کافی مطبوعات لے گئے تھے۔ چونکہ پاکستانی کتابیں ہندوستان میں آسانی سے نہیں ملتیں یا صرف اُس وقت ملتی ہیں جب ان کے نقلی ایڈیشن مقامی طور پر چھاپے جائیں، چنانچہ کتابوں کے ہندوستانی تاجر اس موقع کو غنیمت جانتے ہیں اور اپنے پاس پاکستانی کتابوں کا ذخیرہ کرنے کے لئے اس قومی میلے سے پاکستانی مطبوعات ڈھیروں کے حساب سے لے جاتے ہیں، کچھ بھی ہو، اس بہانے کتابوں کو سرحد پار کرنے کا موقع مل جاتا ہے جو غنیمت ہے۔

اب آیئے، کتابوں کے قومی میلے میں سجی ہوئی ہندی کتابوں کی طرف۔ ان کو تو شمار کرنا دوبھر تھا لیکن جو چیز قابلِ دید تھی وہ اردو کے مقبول شاعروں کا کلام ہندی رسم الخط میں تھا۔ احمد فراز اور پروین شاکر کی کتابیں قطاروں میں چنی ہوئی تھیں۔ اساتذہ کا کلام دیوناگری رسم الخط میں کثرت سے دستیاب تھا۔ کسی زمانے میں کسی ناشر نے یہ کلام سستی کتابوں میں چھاپ کے ملک بھر میں پھیلا دیا تھا۔ اب یہی کلام خوش نما اور دیدہ زیب کتابوں کی صورت میں نکل آیا ہے اور آنکھوں کو بھلا لگتا ہے۔ مگر ان میں سب سے بڑھ کر ہندی میں دیوانِ غالب تھا۔ لوگوں نے یہ دیوان ایسے اہتمام اور انتظام سے شائع کیا ہے کہ وہ لکھیں اور پڑھا کرے کوئی۔ دیکھ کر جتنی حیرت ہوئی اس سے زیادہ یہ سن کر مسرت ہوئی کہ اردو میں یہ دیوان ایک فروخت ہوتا ہے تو ہندی میں چھ۔

میں نے ایک ناشر سے پوچھا کہ میر تقی میر کا کلام نہیں چھاپا آپ نے؟ کہنے لگے کہ چھاپا تھا، سارا بک گیا۔ خدائے سخن جو ٹھہرے۔

میں آخر میں وہ واقعہ بیان کرنا چاہوں گا جو سنہ ۸۵ء میں میرے مشاہدے میں آیا تھا۔ اپنے پروگرام جرنیلی سڑک کی تیاری کے سلسلے میں سفر کرتا ہوا میں انبالہ پہنچا اور وہاں کی ایک قدیم اور تاریخی مسجد دیکھنے گیا۔ سنہ ۴۷ء کے فسادات میں سرحد پار کرنے والے مہاجروں کی جو بہو بیٹیاں اٹھالی جاتی تھیں اور ان میں سے جو واگزار ہو جاتی تھیں انہیں لا کر انبالہ کی اس مسجد میں رکھا جاتا تھا چنانچہ کہتے ہیں کہ یہاں برسہا برس رات دن قرآن کی قراءت گونجا کرتی تھی جس میں عقیدت اور کرب کی ایسی آمیزش ہوتی تھی جو سننے والوں کے جگر میں خنجر بن کر اتر جایا کرتی تھی۔

تقسیمِ ہند کے تقریباً ۳۸ سال بعد میں انبالہ کی وہی مسجد دیکھنے پہنچا۔ قرینے سے آراستہ مسجد کے اندر دھیمی دھیمی روشنی میں دو نوعمر لڑکے مولوی صاحب سے کچھ پڑھ رہے تھے۔ میں نے قریب جا کر دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ قرآن پڑھا جا رہا ہوگا۔ وہ ہندو لڑکے تھے، وریندر کمار اور بلرام، جو اردو پڑھ رہے تھے۔ میں خوش تو ہوا مگر حیران زیادہ ہوا اور ایک لڑکے سے پوچھا کہ تم اردو کیوں پڑھ رہے ہو۔ اس نے کہا کہ ہمارے کاروبار میں سارا حساب کتاب اب تک اردو میں رکھا جاتا ہے اس لئے ہم لوگ اردو سیکھتے ہیں۔

دوسرے لڑکے سے پوچھا کہ تم اردو کیوں سیکھ رہے ہو؟

اس نے کہا۔ "بھاشا گیان کے لئے۔"

کوئی کچھ بھی کہے، اب انبالہ کے وریندر کمار اور بلرام ہی نہیں پورا ہندوستان بھاشا گیان میں مصروف ہے۔ ارادتاً نہ سہی، غیر ارادی طور پر ہی سہی۔

میں نے اردو کے ایک ہندو استاد سے خوش ہو کر پوچھا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

اُتنے ہی خوش ہو کر میرے کان میں بولے۔ "بس چپ رہئے۔"

تو براہ کرم میری اس تحریر کو چپ کی تحریر سمجھ کر پڑھا جائے۔

زیب النسا کا ہندوستان

چند مہینے ہوئے میں نے لکھنؤ کے غریب بچوں کی امداد کے لئے کچھ رقم بھیجی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد وہاں سے وصولی کی رسیدیں آگئیں۔ سب پر بچوں کے دستخط لئے گئے تھے کہ انہیں رقم مل گئی ہے۔ پہلی ہی رسید کی آخری سطر میں کسی بچی نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے لکھا تھا۔ 'زیب النساء'۔

بچی نے شاید اپنی زندگی کے پہلے دستخط کئے تھے۔

زیب النسا نے اپنا نام ہندی میں لکھا تھا۔

یہی صورت پورے ہندوستان کے بچوں کی ہے۔ البتہ کھاتے پیتے گھرانوں کا معاملہ جدا ہے۔ ان کے بچے تو شاید خواب بھی انگریزی میں دیکھتے ہیں اور والدین کی ڈانٹ بھی انگریزی میں کھاتے ہیں۔ زیب النسا تو شاید انگریزی میں خواب نہ دیکھ پائے، اردو ہی میں دیکھے لیکن اگر خوابوں کا کوئی رسم الخط ہوتا ہے تو وہ ہندی ہی ہوگا۔ میں اس کے دستخط دیکھتے دیکھتے ماضی میں بہت دور چلا گیا۔ ابھی برصغیر تقسیم نہیں ہوا تھا لیکن اسکولوں میں مسلمان بچوں کو ہندی پڑھانے

کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ میں بھی ان بچوں میں تھا۔ ایک پنڈت جی ہمیں ہندی پڑھاتے تھے۔ اچھی پڑھاتے تھے یا بری، یہ تو مجھے پتہ نہیں مگر رسم الخط کا نظام اتنا سائنسی تھا کہ اس کی تمام باریکیاں آسانی سے سمجھ میں آ گئیں اور میں دیکھتے دیکھتے روانی سے ہندی لکھنے لگا۔ ہندی املا میں مجھے ہمیشہ دس میں سے دس نمبر ملا کرتے تھے۔

ان دنوں ہندو مسلم تفریق اور امتیاز کا مسئلہ کچھ ایسی شکل اختیار کر گیا تھا کہ میں اپنے امتحانی پرچوں کے جواب رواں ہندی میں لکھنے لگا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ ممتحن کو لڑکے کے دین دھرم کی خبر نہ ہونے پائے۔

۱۹۵۰ء کے آخر میں ہم ہندوستان چھوڑ کر پاکستان چلے گئے اور مقام شکر ہے کہ ابتدائی دنوں کے تعصبات کے باوجود بھارت میں اردو تعلیم کی رگِ حیات قطع نہیں ہوئی تھی۔ پاکستان میں اس وقت ذریعہ تعلیم اردو تھا اور مجھے ایک روز بھی پریشانی نہیں ہوئی لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ اگر میں ہندوستان ہی میں ہوتا تو مجھ سے زیادہ میرے بچے ہندی روانی سے پڑھ اور لکھ رہے ہوتے۔

ہندوستان سے جب بھی اردو کا کوئی شاعر، ادیب یا دانش ور برطانیہ آتا ہے تو اس سے یہ رٹا رٹایا سوال ضرور کیا جاتا ہے کہ بھارت میں اردو کا کیا حال ہے؟

اس سوال پر طرح طرح کے جواب ملتے ہیں جن میں غضب کا تنوع ہوتا ہے۔ کبھی اِس سرے، کبھی اُس سرے۔ اکثر جواب یہ ہوتا ہے کہ حال کچھ اتنا برا نہیں۔ بعض اوقات ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ہاں کچھ مشکلیں ہیں مگر دور ہو جائیں گی۔

مجھے یاد ہے، کراچی کی سرسید یونیورسٹی میں انجمن ترقی اردو کی صد سالہ تقریبات منائی جا رہی تھیں جن میں ہندوستان سے کوئی بزرگ تشریف لائے تھے۔ انہوں نے جو اپنا خطبہ پڑھنا شروع کیا تو بالکل یوں لگا کہ سرزمین ہند پر ہر طرف اردو کی کھیتیاں لہرا رہی ہیں، اردو ہی کے گل ہیں اور اردو ہی کے بوٹے جن پر آسمان سے اردو ہی کی شبنم گر رہی ہے۔

جی چاہا کہ اٹھ کر ان کے ساتھ اردو ہی میں سلوک کیا جائے مگر پھر یہ سوچ کر چپ ہو رہا

کہ اگر انہوں نے پلٹ کر پاکستان میں اردو کی حالت کا سوال اٹھا دیا تو جواب کا بار اپنے کاندھوں پر کیونکر اٹھاؤں گا۔

کوئی مجھ سے پوچھے تو میں کہوں گا کہ ہندوستان میں اردو زبان کی بقا اور وجود پر چند افراد اور اداروں کا جتنا احسان ہے اس سے بڑا احسان وہاں کی جیتی جاگتی جمہوریت اور انصاف کی طرف جھکتے ہوئے عدلیہ کے پلڑے کا ہے۔

سیکولر جماعتیں ہوں یا نیشنلسٹ پارٹیاں، انہیں بار بار لوگوں سے ووٹ مانگنا ہوتا ہے اور لوگوں میں وہ لوگ کچھ کم نہیں کہ اردو کو جن کی زبان مان لیا گیا ہے۔ مسلمان ووٹروں کی خوشنودی کے لئے ہندوستان کی وفاقی حکومت اور ریاستی حکومتیں اردو کے فروغ کے منصوبوں کو بڑھاوا دیتی ہیں، اس سے اوروں کو ہو تو ہو، مجھے انکار نہیں۔

مرکز میں اردو کی ترقی اور فروغ کے کتنے ہی ادارے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہر ریاست میں اردو کی ایک نہ ایک اکیڈمی ہے۔ ان سب کو سرکاری خزانے سے رقم ملتی ہے۔ میں نے کبھی کسی اکیڈمی اور ادارے کو یہ کہتے نہیں سنا کہ رقم کم ہے۔ میں نے تو یہ سنا ہے کہ اردو کے چند ایک ادارے مالی سال کے خاتمے تک ساری رقم خرچ نہیں کر پاتے تو نو آموز شاعروں کے کلام کے مجموعے چھاپ کر، سیمینار کرا کے اور نقد انعامات دے کر اس رقم کو ٹھکانے لگاتے ہیں۔

ایک بار ایسے ہی ایک سیمینار میں شرکت کے لئے برطانیہ سے اردو کے چھ شاعر اور ادیب بلائے گئے۔ تین دن کا سیمینار تھا۔ دو روز تک مقامی خواتین اور حضرات علم کے ڈنکے بجاتے اور دریا بہاتے رہے۔ تیسرے دن انگلستان کے نصف درجن دانش وروں کی باری آئی۔ باری تو آ گئی، سامعین نہیں آئے۔ روایت یہ ہے کہ ان چھ سواروں نے اپنے مقالے خود ہی پڑھے، خود ہی سنے اور بحالت مجبوری خود ہی تالیاں بجائیں۔

کچھ بھی ہو، ہندوستان میں اردو ہے اور نظر آتی ہے۔ اُس پورے علاقے میں جو ہندوستان کی ہندی کی پٹی کہلاتا ہے، کہیں سڑکوں کے نام دوسری زبانوں کے ساتھ اردو میں بھی لکھے ہیں اور کہیں ریلوے اسٹیشنوں کے نام بدخط حروف میں سہی، اردو میں بھی لکھے ہیں۔ بلکہ

آپ یو پی سے بنگال کی طرف جانے والی ریل گاڑی میں بیٹھیں تو راہ میں پڑنے والے ہر اسٹیشن پر اس کا نام اردو میں بھی لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ پھر چلتے چلتے اچانک منظر بدلتا ہے اور اردو تحریر غائب ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ریل گاڑی بہار کو پیچھے چھوڑ کر بنگال میں داخل ہو گئی ہے۔

بہار میں تو خیر اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ وہاں آپ تمام سرکاری کارروائی اردو میں کر سکتے ہیں۔ لیکن بنگال کا معاملہ اس سے بھی کہیں زیادہ دلچسپ ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک روز میں شہر کلکتہ میں داخل ہوا۔ جاڑے کی صبح تھی۔ پھیکی پھیکی سی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ اب جو سڑک پر دونوں جانب نگاہ ڈالتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ لوگ بیٹھے اردو اخبار پڑھ رہے ہیں۔

میری آنکھوں پر چشمہ تھا جن کے پیچھے میری چشم حیرت تھی۔ کلکتے کی شور مچاتی ٹرام سے اتر کر میں نے جس سے بھی اردو میں بات کی اس نے اردو میں جواب دیا۔ ایسا تو حیدرآباد دکن میں بھی نہیں ہوا تھا جہاں میں نے ایک نوجوان سے اردو میں راستہ پوچھا تو اس نے انگریزی میں سمجھایا۔

کلکتے کے بارے میں تو یوں بھی مشہور ہے کہ شہر کی زبان بنگالی نہیں۔ وہاں بنگالی بولنے والی آبادی شہر سے باہر رہتی ہے۔ ملازمت اور روزگار کے لئے صبح شہر میں داخل ہوتی ہے اور دن ڈھلنے سے پہلے اپنا کلکتہ دوسری بولیوں کو سونپ کر واپس چلی جاتی ہے۔

جن دنوں میں گیا تھا، کلکتے سے اردو کے دو بڑے اخبار نکلتے تھے۔ وہ کوئی عام سے کام چلانے والے اخبار نہیں تھے بلکہ پاکستان کے کسی بھی اردو روزنامے کے مقابلے پر رکھے جا سکتے تھے۔ پھر لوگوں نے بتایا کہ اردو کے لئے بنگال کی بانہیں کھلی ہوئی ہیں۔ خود بنگالیوں نے کہا کہ یو پی میں ہندی کو اردو سے خطرہ ہوگا، بنگال میں ہمیں اردو سے کوئی خطرہ نہیں۔

بالکل یہی بات ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں کہی جاتی ہے۔ ایک اتر پردیش ہی ہے اور وہاں کا صدر مقام لکھنؤ ہے جسے اردو سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ وہاں تو یوں لگتا ہے کہ صدیوں کی شستہ اور شائستہ بولی کو عمداً، قصداً اور انتقاماً پیچھے چھوڑا جا رہا ہے۔

میں ایک بار پیرس کے ایک ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔ وہاں دو دروازے تھے۔ دونوں پر فرانسیسی زبان میں کچھ لکھا تھا۔ ظاہر ہے ایک دروازہ باہر جانے کے لئے تھا اور دوسرا اندر آنے والوں کے لئے۔ میں نے ذہن پر بہت زور ڈالا اور دونوں دروازوں پر لکھی ہوئی عبارت میں کوئی مماثلت ڈھونڈ کر یہ طے کرنے کی کوشش کی کہ باہر جانے کا دروازہ کون سا ہے۔ بالآخر فال ایک دروازے کے حق میں نکلی۔ میں اُسی راستے باہر جانے لگا۔ اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہر طرف سے آوازیں کیوں بلند ہوئیں۔

میرے ساتھ بالکل یہی واقعہ لکھنؤ کے ہوائی اڈے پر پیش آیا۔ وہاں بھی دو دروازے تھے۔ دونوں پر اُسی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا جسے آپ چاہیں تو ہندی کہہ لیں۔ میں چونکہ ہندی پڑھ لیتا ہوں، مجھ سے اول تو وہ گاڑھے لفظ پڑھے ہی نہیں گئے اور جیسے تیسے پڑھے بھی گئے تو میرے دونوں کاندھوں پر بیٹھے ہوئے فرشتے میری لولی لنگڑی خواندگی پر ہنسے تو ہوں گے پیٹ پکڑ کر (اپنا)۔

کاش، اے کاش میں صاحب اختیار ہوتا تو لکھنؤ کے اس ایک دروازے پر لکھواتا۔ 'تشریف لائیے، آداب عرض'۔ اور دوسرے پر بھی اسی مناسبت سے کچھ لکھواتا۔ یہ میں اس لئے بھی کہہ رہا ہوں کہ اسی ہوائی اڈے کے غلط دروازے سے نکل کر جب میں لکھنؤ کے ایک بڑے ہوٹل کے صحیح دروازے پر پہنچا تو دربان نے میرے لئے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ 'تشریف لائیے۔ آداب عرض'۔

یہاں لکھنؤ کے ریلوے اسٹیشن کا حال بھی سننے سے تعلق رکھتا ہے جس کی عمارت تو خالص اسلامی طرز کی ہے لیکن اسٹشن کے تمام دفتروں اور کھڑکیوں پر لکھی ہوئی عبارتیں قطعی خارج از اسلام ہیں۔ ذرا سوچئے، کہاں پھول کی پتیوں جیسا لکھنؤ اور کہاں ریزرویشن کے دفتر پر ہندی میں لکھا ہوا۔ 'آرکچھن'۔

ایسی ہی عبارتیں پڑھ کر تو میں نے اسٹشن سے باہر آکر تانگے والے سے کہا تھا کہ مجھے کسی ایسی جگہ لے چلو جہاں کھانے کو کھانا اور پانی کو پانی کہتے ہوں۔ چنانچہ وہ مجھے چوک

میں ٹنڈے کے کباب کی دکان پر لے گیا۔ وہی چوک جس میں کبھی انسان چلتا تھا تو ٹھمریاں اور دادرے دور تک اس کا تعاقب کیا کرتے تھے۔ خیر یہ اس کا نوحہ پڑھنے کا مقام نہیں۔ کون سی چیز اپنے ٹھکانے پر رہ گئی ہے جو چوک کی شامیں اور بنارس کی صبحیں اوراق مصور بن جاتیں۔

اسی لکھنؤ کا ذکر ہے، مجھے اور میرے ساتھ دوسرے مہمانوں کو ایک خیراتی اسپتال دکھایا گیا جو مسلمانوں کے ایک محلے میں کھولا گیا تھا۔ اسپتال کا نام تھا 'زین العابدین اسپتال'۔

حضرت زین العابدینؓ بارہ اماموں میں چوتھے امام تھے۔ وہ امام حسینؓ کے بیٹے تھے اور سانحہ کربلا کے دوران بیمار تھے اس لئے واقعہ کربلا میں عابدِ بیمار کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اُن ہی کے نام پر یہ اسپتال کھولا گیا تھا جہاں غریب غربا کا مفت علاج ہورہا تھا۔ اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اکثر مریض مسلمان تھے جن کے بارے میں یہ طے کرلیا گیا ہے کہ اردو ان ہی کی زبان ہے۔ لیکن زین العابدین اسپتال کی دیواروں پر تمام بورڈ اور ساری عبارتیں ہندی میں لکھی تھیں۔ چلئے ہندی لپی کی بات تو اب سمجھ میں آنے لگی ہے۔ لیکن اگر خون کو خون اور ہڈی کو ہڈی لکھ دیتے تو بھی ہمیں صبر آجاتا مگر وہاں تو لکھنے والوں نے سنسکرت کو بھی پیچھے چھوڑ دیا بلکہ جب میں نے کہا کہ میں ہندی پڑھ لیتا ہوں تو کچھ مقامی باشندوں نے مجھے آزمانے کے لئے اسی عبارت کا ایک لفظ پڑھوا کر بھی دیکھا۔

اس روز میں نے خود کو نہیں بلکہ اپنے پنڈت جی کو دس میں سے دس نمبر دیئے۔

یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ امام زین العابدینؓ بیمار تھے۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے اسپتال کو کیوں بیمار ڈال دیا گیا۔

وہیں لکھنؤ میں مجھے اردو کے ایک بہت بڑے عالم کے گھر میں قیام کا شرف ملا۔ ان کے سارے پوتے پوتیاں اسکول کا ہوم ورک لے کر میرے گرد جمع ہوگئے تاکہ میں ان کے اسکول کے کام میں ان کا ہاتھ بٹاؤں۔ میں ہاتھ کہاں سے بٹاتا۔ ان کا سارا ہوم ورک ہندی میں تھا۔

مجھے افسوس نہیں ہوا۔ شاید ہوتا یہی ہے۔ انگلستان میں رہ کر خود میرے بچوں نے اسکول ہی کا نہیں زندگی کا سارا ہوم ورک انگریزی میں کیا ہے۔

اتر پردیش کی اردو اکیڈیمی لکھنو ہی میں ہے اور بلا شبہ اردو کے حق میں بھلے کام کرتی رہتی ہے۔ بیشتر پرانی اور نادر کتابوں کے اصل نسخوں کے عکس چھاپ کر انہوں نے اچھا کام کیا۔ لیکن ایک بار مجھے لکھنو کے ریڈیو اسٹیشن جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں سے میرا انٹرویو نشر ہو رہا تھا۔ گفتگو کے دوران انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ بی بی سی لندن سے ۲۴ گھنٹوں میں اردو پروگرام کو کتنا وقت ملتا ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ پونے دو گھنٹے۔ اور میں اگر چہ جواب دینے کے لئے بلایا گیا تھا لیکن میں نے اپنی سادگی میں ان سے سوال کر ڈالا کہ لکھنو کے ریڈیو اسٹیشن سے اردو کو روزانہ کتنا وقت ملتا ہے۔

وہ آہستہ سے بولے۔ 'آدھا گھنٹہ'۔

اسی لکھنو کا واقعہ ہے۔ میں ایک تقریب میں شریک تھا اور مجھے تقریر بھی کرنی تھی۔ شہر کے قلب میں ہونے والی اس تقریب کی کارروائی خالص انگریزی میں جاری تھی۔ نہایت پڑھے لکھے حضرات مسلسل انگریزی بول رہے تھے۔ میری باری آئی اور مجھے اسٹیج پر بلایا گیا تو میں نے کہا۔ 'خواتین وحضرات۔ ابھی تک آپ نے اہلِ لکھنو کی انگریزی سنی۔ اب اہل انگلستان کی اردو سنئے۔' اس پر مجمع تو مسرور ہوا لیکن میں آج تک نادم ہوں۔ اس طرح کی بات کہہ کر میں نے ایسے ثقہ حضرات کی دل آزاری کی اور لکھنو کی مروت اور لحاظ کو بالائے طاق رکھ دیا۔ بری بات۔

غالباً لکھنو ہی کا ذکر ہے۔ سنسکرت کی ایک مسلمان طالبہ نے اپنی ڈاکٹریٹ کامیابی سے مکمل کی جس کے بعد اپنے مقالے کی ایک جلد گیان چند جین صاحب کو بھیجی اور اس پر لکھنا چاہتی تھی ''اردو کے استاد کی خدمت میں''۔ لیکن لفظ اردو اس نے ع سے لکھا۔ ''عردو کے استاد کی خدمت میں''۔

اس کے جواب میں گیان چند جین صاحب نے اسے لکھا۔ ''بی بی، سنسکرت پڑھ کر تم نے یوں ہی کفر اختیار کیا تھا، اب اردو کو عردو لکھ کر بالکل ہی جہنمی ہوگئی ہو۔''

دہلی کا حال ذرا مختلف ہے۔ ابھی سنہ ۲۰۰۴ء کے اوائل میں مجھے دہلی جانے کا اتفاق

ہوا تو شہر میں چلنے والی بسوں پر اردو تحریر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ہر بس پر لکھا تھا کہ ماحول کے تحفظ کر خیال سے آپ کی یہ بس قدرتی گیس سے چلائی جارہی ہے۔ بس کے ایک رخ پر یہی عبارت ہندی میں اور دوسرے پہلو پر اردو میں لکھی تھی، اور اردو بھی صاف اور خوش خط۔

بمبئی کو، جو ایک بار پھر ممبئی ہو گیا ہے، میں نے بہت زیادہ نہیں دیکھا مگر وہاں کے آنجہانی کالی داس گپتا رضا کو دیکھ لینا کافی ہے۔ بتاتے تھے کہ اردو کے نام پر ہزارہا شخص اکٹھا ہو جاتا ہے۔ ان کی ریاست مہاراشٹر میں کئی جگہ اور کئی بار اردو میلہ لگایا گیا۔ ایک خلقت اُمڈ آئی اور ساری کی ساری ہندی خواں۔

کسی نے گپتا صاحب سے کہا کہ ہندی والوں کے لئے غالب کے منتخب اشعار کی تشریح لکھ دیجئے۔ انہوں نے یہ کام بھی کر دکھایا۔ جگہ جگہ بلائے گئے کہ اردو کے بارے میں لیکچر دیجئے۔ مہاراشٹر میں صاحب حیثیت مسلمانوں نے مسلمان بچوں کی تعلیم کے لئے بڑے کام کئے ہیں اور مجھے تعداد کا صحیح علم نہیں لیکن بہت سارے مقامات پر ان بچوں کے لئے اسکول کھولے ہیں۔ میں نے کسی سے پوچھا کہ ان اسکولوں میں تو ہندو بچے بھی بجا طور پر داخلے کا حق مانگتے ہوں گے۔ جواب ملا کہ ان اسکولوں کے جو نام رکھے جاتے ہیں ان میں لفظ 'اردو' لگا دیا جاتا ہے۔

میں نہیں مانتا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے لیکن یہ بات اتنی تکرار اور اتنے اصرار کے ساتھ کہی جاتی ہے کہ مسلمانوں نے اسے سچ جان لیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جنوبی ہند کی ریاستوں میں جہاں اردو کا کبھی گزر بھی نہیں تھا، مسلمانوں نے اپنے بچوں کو اردو پڑھانی شروع کر دی ہے اور غالباً یہ کہہ کر اچھا، یوں ہے تو یوں ہی سہی۔

حیدرآباد، آندھر پردیش میں تو اردو یونیورسٹی کھل گئی ہے جو ڈاک کے ذریعے تمام مضامین پڑھاتی ہے۔ ڈاک کے ذریعے اردو پڑھانے کا بھی ہندوستان میں اچھا خاصا چلن ہے۔ کئی اداروں نے یہ کام سنبھال رکھا ہے لیکن ایک سرکاری ادارہ اس میں پیش پیش ہے جہاں سے اس طرح کی خبریں آتی رہتی ہیں کہ اس سال ایک سابق وزیر داخلہ اور ایک بڑی اداکارہ کی بیٹی نے بھی داخلے کی درخواستیں بھیجی ہیں۔

مگر ادارہ پھر ادارہ ہوتا ہے۔ اسی ادارے میں ہمارے دلی کے ایک دوست کی بیوی نے بھی درخواست اور داخلے کی فیس بھیجی۔ لیکن دونوں کا وہی حال ہوا جو کبھی خدا کا اور وصال صنم کا ہوا تھا۔ بے چاری بازار سے خالص بازاری قسم کی کتابیں خرید کر خود ہی پڑھ رہی ہیں۔ میں وہ کتابیں اٹھا کر ذرا یوں ہی دیکھنے لگا تو محسوس ہوا کہ میری اردو خراب ہونے لگی ہے۔ ڈر کر جلدی سے بند کر دیں۔

بھارت سرکار کے بارے میں جو دو چار باتیں ماننی پڑیں گی انہیں بیان کرنے سے پہلے یہ خیال آیا کہ لفظ 'سرکار' ہمارا ہے۔ اسے ہندی والوں نے لے لیا تو ہم نے چھوڑ دیا۔ ہاں تو حکومتِ ہند کے بارے میں ماننا پڑے گا کہ اردو کے نام پر کم سے کم درجن بھر سرکاری ادارے خوب کام کر رہے ہیں۔ اردو اکادمی، دہلی۔ انجمن ترقی اردو (ہند)۔ ترقی اردو بورڈ، نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا۔ ترقی اردو بیورو۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔ نیشنل اکادمی اور تعلیمی تحقیق و تربیت کی قومی کونسل (این سی ای آر ٹی) ان میں سے محض چند ہیں۔ ساہتیہ اکیڈمی اگرچہ ملک کی ساری ہی زبانوں کا بھلا چاہتی ہے لیکن وہاں بھی اردو کسی طرح پیچھے نہیں۔

پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ اور کئی نیم سرکاری اور نجی اشاعت گھر اردو کی کتابیں اور جریدے شائع کر رہے ہیں۔ ادھر ہندوستان میں کاغذ سازی اور طباعت کے ساتھ جلد سازی نے جو ترقی کی ہے تو خوش شکل اور دیدہ زیب کتابیں نظر آنے لگی ہیں۔ جو بھی ہے، جیسا بھی ہے، ایسا ہے کہ اچھا کہیں جسے۔

ہندوستان میں ایک اور اچھا کام ہوا ہے۔ جب یہ طے ہو گیا کہ بہت سے اردو داں اب اردو تو پڑھنا چاہتے ہیں لیکن اردو رسم الخط سے کٹ کر رہ گئے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے ہندی یا دیوناگری رسم الخط میں اردو رسالے شائع ہونے لگے ہیں۔ اس سلسلے میں جودھ پور، راجستھان کا ادبی جریدہ شیش (بروزن پیش) قابل ذکر ہے جو اعلیٰ اردو تخلیقات کو دیوناگری حروف میں چھاپتا ہے۔ اس طرح ہفت روزہ جدید مرکز ہے جو ایک ساتھ لکھنو اور دہلی سے شائع ہوتا ہے۔ اس کی زبان اردو مگر لکھائی ہندی ہے۔

مجھے معلوم نہیں کہ ہندوستان میں کوئی کل وقتی اردو ریڈیو اسٹیشن ہے یا نہیں لیکن ہمہ وقت اردو ٹیلی وژن ضرور ہے اور وہ ہے ای ٹی وی اردو۔ اسے حیدر آباد دکن کے راموجی راؤ کا اینا ڈو گروپ چلاتا ہے اور ہم غریبوں کی دعائیں لیتا ہے۔

ہندوستان میں اردو روزناموں کی کمی نہیں۔ کچھ اخبار سیاسی جماعتوں کے ہیں، کچھ کاروباری اداروں کے اور کچھ نجی اخبار ہیں۔ یہی حال رسالوں کا ہے لیکن ہندوستان میں اردو طباعت کو جو فروغ نہ ہندو دے سکے نہ مسلمان، وہ فروغ کمپیوٹر نے دیا ہے۔ جب سے کاتب اور کتابت کی قید سے رہائی ملی ہے اور گھر کے ایک گوشے میں بیٹھ کر اردو طباعت کرنا ممکن ہوا ہے، محلے محلے اردو کتابیں اور رسالے ترتیب پانے لگے ہیں، کچھ مذہبی اور کچھ سیاسی، لیکن حیرت انگیز طور پر بڑی تعداد اردو کے ادبی جریدوں کی ہے۔ ان جریدوں کی تو شان ہی نرالی ہے۔ ان میں بڑے بڑے لکھنے والوں کے نام شامل ہونا اور ان کا ضخیم ہونا خدا جانے کیوں لازمی ہے، لہٰذا چار چار سو، پانچ پانچ سو صفحوں کے اردو ادبی رسالے ایسی ایسی ریاستوں سے نکل رہے ہیں جہاں اردو کا سورج نکلنا دشوار سمجھا جاتا تھا۔

بس وہ لکھنؤ جو کبھی اردو کی جان تھا، ادھ موا ہوا جاتا ہے۔ خدائے سخن میر تقی میر اسی لکھنؤ کی خاک کا پیوند ہوئے تھے مگر ریلوے لائین نکالنے والوں نے ان کی تربت ہی کو مٹا دیا اور غریب کا نشان تک نہ رہنے دیا۔

اب رہ گئے میر انیس تو ایک بار مجھے ان کی قبر پر جانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ لکھنؤ کے ایک محلے میں، مکانوں کے بیچ، ذرا اونچے ٹیلے پر انیس کی قبر ہے جس پر شہر والوں نے نہیں، کچھ پردیسیوں نے مقبرہ تعمیر کرا دیا ہے جو اگرچہ چاروں طرف سے کھلا ہوا ہے لیکن سائے میں اس کا فرش ٹھنڈا رہتا ہے جس پر میں ننگے پاؤں چلا تو اچھا لگا۔ مگر مجھ سے زیادہ کہیں اچھا بکریوں کے ان چھوٹے چھوٹے بچوں کو لگ رہا ہوگا جو اسی ٹھنڈے فرش پر رخسار ٹیک کر گہری نیند سو رہے تھے۔

انیس اگر اتنے ہی بد دماغ ہوتے جتنا لوگ کہتے ہیں تو کفن پھاڑ کر نکل آتے۔

کچھ بھی ہو، اردو کے معاملے میں ہندوستان اب وہ ہندوستان نہیں رہا جہاں کبھی

گوپی چند نارنگ کے بقول، ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان یعنی اردو رائج تھی۔ جسے اس بات پر یقین نہ آئے، اسماعیل میرٹھی کی درسی کتابیں اٹھا کر دیکھ لے جن کے آدھے صفحے ہندو بچوں کو ذہن میں رکھ کر لکھے گئے ہوں گے۔ آج حالت یہ ہے کہ یہ کتابیں ہندوستان کے شہر شہر اور نگر نگر میں دستیاب ہیں لیکن پاکستان میں کسی کو ان کی نئی اشاعت کا خیال تک نہیں آتا جب کہ ہم سب کے، میرا مطلب ہے، ہم میں سے بیشتر کے بزرگ یہی کتابیں پڑھ کر بڑے ہوئے ہوں گے اور وہ اگر ہم سے زیادہ دردمند اور روادار تھے تو بلا وجہ تو نہ تھے۔

میں سوچتا ہوں کہ آج اگر میں بھی سرزمینِ ہند پر ہوتا تو میرے بچے، ہر چند کہ میرے ہی ہوتے، مگر جب چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اپنا نام لکھتے تو زیب النسا ہی لکھتے۔ ہندی میں۔

جذباتی الجھنیں

یہ بات زیادہ پرانی نہیں۔ نئی صدی شروع ہوئے چار برس ہی گزرے تھے اور اوّل روز سے نظر آنے لگا تھا کہ اس صدی کے تیور اچھے نہیں۔ ہر طرف خودکش حملہ آوروں نے خون کی ٹونٹیاں کھول رکھی تھیں اور بعض ایک تو ان ہی میں وضو کر کے سیدھے جنت کو سدھار رہے تھے۔ نیویارک میں وہ دھماکہ ہو چکا تھا جس نے لمبی قطاروں میں ایستادہ اینٹوں میں سے پہلی اینٹ لڑھکا دی تھی۔

اسی دوران ایک بم اردو دنیا میں بھی پھٹا۔ یہ اَور طرح کا بم تھا۔ یہاں برطانیہ والے اسے اسٹنکنگ بم کہتے ہیں۔ یہ پھٹتا ہے تو دھماکہ نہیں ہوتا، بدبو پھیلتی ہے۔

کسی من چلے نے غالباً شہر کراچی میں، جسے ایک مشاعرے کے منتظمین شہر قائد کہتے ہیں، ایک گمنام پرچہ تقسیم کیا۔ پرچے میں ایک بڑے شاعر اور ان سے بھی بڑے ایک نثر نگار کے بارے میں مغلظات کا وہ طومار باندھا گیا کہ ادب پر جتنے بھی جمود طاری تھے، سارے کے سارے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ پرچے میں جتنی زیادہ واہی تباہی تھی اتنی ہی زیادہ اس کی دھوم ہوئی۔ جاری کرنے والے نے دس بیس چھاپے ہوں گے، آگے لوگوں نے اس کی سینکڑوں نقول کر ڈالیں۔ وہ

تحریر گھر گھر جا پہنچی۔ جن گھروں میں کبھی عورتوں کو مثنوی زہرِ عشق پڑھنے کی اجازت نہ تھی وہاں کی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں نے بھی وہ پرچہ پڑھا اور پڑوسن کو سنانے سے پہلے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ اپنے کانوں کو۔

جن بڑے شاعر کا تذکرہ تھا وہ تو یہ کہہ کر بیٹھ رہے کہ دیکھئے کچھ کرتے ہیں لیکن ان سے بھی بڑے جن نثر نگار پر خدا جانے کیا کیا اچھالا گیا تھا، سنا ہے ان کا دل بہت دکھا۔

پرچے میں ان دو حضرات ہی کو نہیں، درجنوں کے حساب سے خواتین کو بھی بھگتا دیا۔ ان میں کچھ ایسی تھیں کہ اس کی سزاوار نہ تھیں، اور کچھ ایسی کہ مصنف نے ان کے نام نہ ڈالے ہوتے تو بے شمار قارئین اپنی طرف سے ڈال دیتے۔

جس کسی نے بھی گمنام پرچہ لکھا ہوگا وہ چپ سادھے یہ سارا تماشا دیکھتا رہا۔ مگر اس پورے ڈرامے کا دوسرا اسین اور زیادہ چونکانے والا نکلا۔ اب عالمِ اردو میں ایک سرے سے دوسرے تک یہ قیاس آرائی شروع ہوئی کہ اُس گمنام مصنف کا نام کیا ہے۔

دو چار نام لئے جاتے تب بھی غنیمت تھا۔ خلق خدا نے غائبانہ بھی اور منہ پر بھی ایک شاعر کا نام لینا شروع کر دیا۔ لوگ خم ٹھونک کر دعوے کرنے لگے کہ ہو یا نہ ہو، اس کے مصنف فلاں صاحب ہیں۔

اب تو یہ عالم ہوا کہ ان کا گھر سے نکلنا محال ہو گیا۔

انگلیاں لوگ اٹھاتے ہیں کہ وہ آتے ہیں

بات اتنی بڑھی کہ سنا ہے انہوں نے ایک محفل میں قرآن کی قسم کھا کر اعلان کیا کہ یہ پرچہ انہوں نے نہیں لکھا۔ یہ بھی سنا ہے ان کا اٹھ کر جانا تھا کہ شرکائے محفل نے قرآن کی قسم کھا کر کہا انہوں ہی نے لکھا ہے۔

یہ اہل اردو کے جذباتی مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے۔ ان مسائل کی فہرست طولانی ہے مگر طوفانی بھی ہے۔ شاعر ادیب کے نطفے میں خرابی ڈالنے سے لے کر ان کے اصل دیہاتی نام

کی کھوج لگانے تک ان خطوں میں کیا نہیں ہوتا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ لوگ انہیں مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔

شاید یہی بات اس طرح کے اور زیادہ خطوط کے اجرا کی تحریک بنتی ہے۔ پھر لطف یہ کہ یہ سلسلہ کسی ایک خطے یا علاقے تک مخصوص نہیں۔ یہ سلسلہ جس شدومد سے جرمنی میں جاری ہے، اسی آن بان سے ریاستہائے متحدہ امریکہ کے پرچم میں ستارے ٹانکے چلا جاتا ہے۔ کہیں کہیں تو چور اتنے دلاور ہو گئے ہیں کہ رسالوں میں اپنے نام سے، اور بعض اوقات مدیر کو پیسے دے کر چھپوانے لگے ہیں۔ اچھے بھلے پڑھے لکھے سمجھ دار حضرات کثافت زدہ مضامین لکھ کر چھپے نظر آنے لگتے ہیں۔ رسالے والے ان کے مضامین اس یقین کے ساتھ چھاپتے ہیں کہ اس کے جواب میں اس سے بھی زیادہ گرا ہوا مضمون آئے گا۔ کمال یہ ہے کہ وہ آتا ہے۔ پھر یہ زنجیر کبھی نہیں ٹوٹتی۔

ہمارے گھروں میں کبھی کبھار وہ خط آتے تھے جن میں لکھا ہوتا تھا کہ اس خط کی دس نقلیں کر کے مختلف لوگوں کو بھیجو۔ فلاں خاتون نے بھیجی تھیں، ان کے گھر سونا برسا لیکن فلاں صاحب نے چاک کر کے پھینک دیا تھا، انہیں لقوہ ہوا اور آدھا چہرہ ایک جانب جھولنے لگا۔

ان خطوں کی زنجیر تو کچھ جیالوں نے توڑ ہی دی ہوگی کہ ان کا آنا موقوف ہوا لیکن یہ ادبی شہ پارے اردو کے آنگن میں مسلسل برس رہے ہیں۔

لندن میں ایک صاحب تھے، اللہ کو پیارے ہوئے، بڑے نفیس انسان تھے، ہنرمند غضب کے تھے، عمدہ مصور تھے اور طنز لکھتے تھے تو اس میں بلا کی کاٹ ہوتی تھی، مگر انہوں نے اپنے اس ہنر کی باگ دوسری طرف موڑ دی۔ وہ خالی وقت میں گمنام خط لکھنے لگے اور خالی وقت ان کے پاس کافی تھا۔

یہ ضرور ہے کہ ان کے خط اخلاق سے گرے ہوئے نہیں ہوتے تھے، لیکن اخلاق سے چڑھے ہوئے بھی نہیں ہوتے تھے۔ ایک عالم جانتا تھا کہ وہ لکھتے ہیں۔ وہ سنتے تو مسکرا کر رہ جاتے۔ انکار کی ایسی ادا کسی نے کب اور کاہے کو دیکھی ہوگی۔

وہ بچارے انکار کرتے کرتے مرگئے۔ اس کے بعد اس طرح کے خط آنا بند ہو گئے۔

اقرار کی ایسی ادا بھی کسی نے کبھی نہیں دیکھی ہوگی۔

اہل اردو کے جذباتی مسائل کا ایک کمال یہ ہے کہ وہ روبہ ترقی ہیں۔ جیسے جیسے زمانہ قیامت کی چالیس چل رہا ہے، اردو والے بھی پینترے بدلتے جارہے ہیں۔

ایک تازہ ایجاد بین الاقوامی مذاکروں کی ہے۔ بین الاقوامی مشاعرے تو اکثر ہوا کرتے تھے، حیدرآباد دکن کے ایک مشاعرے میں پاکستان کے نامور مصور صادقین پہنچ گئے۔ وہ ہندوستانی مشاعرہ چشم زدن میں بین الاقوامی ہوگیا۔

بین الاقوامی مذاکروں کی شان ان سب سے جدا ہے۔ لاس اینجلز سے لے کر ٹورانٹو اور لندن سے لے کر تا بخاک کاشغر جہاں جہاں اردو والے آباد ہیں، بین الاقوامی مذاکرے ہورہے ہیں۔ چلئے یہاں تک تو غنیمت ہے۔

ان مذاکروں میں مقالے پڑھنے کے لئے جو بلا کے دانش ور اور غضب کے مدبر بلائے جاتے ہیں ان کی فہرست دیکھ کر زبان سے بے ساختہ الامان اور الحفیظ کا نعرہ بلند ہوتا ہے۔

ان میں شاعروں کا ہونا تو سمجھ میں آتا ہے۔ ایک ٹکٹ میں دو لذتیں اس طرح اٹھائی جاتی ہیں۔ وہ مقالے بھی پڑھتے ہیں، مباحث میں حصہ بھی لیتے ہیں اور اپنا کلام سنا کر مذاکرے سے نتھی مشاعرے کی رونق بھی بڑھاتے ہیں۔

لیکن ان مذاکروں میں وہ دانش ور بھی ضرور بلائے جاتے ہیں جن کو کوئی دانش ور کہے تو کوا کاٹے۔ ان کی خوبی صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ بھی اپنے علاقوں میں بین الاقوامی مذاکرے کراتے ہیں۔ چنانچہ ان سارے مذاکرہ سازوں کے درمیان ایک غیر تحریری سا معاہدہ یہ ہوتا ہے کہ تم ہمیں اپنے سیمینار میں بلاؤ، ہم تمہیں اپنی مجلسِ مذاکرہ میں بلائیں گے۔ غرض یہ کہ دوطرفہ آمد و رفت لگی ہوئی ہے۔ کون کیا لکھ کر لایا ہے اور کیا پڑھ کر سناتا ہے، وہ خود جانے اور اس کی بلا جانے۔ ہم بھی یہ کہتے ہوئے لوٹ آتے ہیں کہ اپنی بلا سے، مگر اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان محفلوں میں دو ایک بوم ضرور بستے ہیں۔

اردو والوں کا ایک اور جذباتی مسئلہ تقریر بازوں کی بہتات ہے۔ کہیں کوئی جلسہ ہو،

مذاکرہ یا مباحثہ ہو، تقریر کرنے والوں کی فوجیں صف آرا ہو کر پہنچ جاتی ہیں اور جب تک فجر کی اذان نہ ہو جائے اور سامعین کی گردنیں ڈھلکنے نہ لگیں، ان کی تقریریں جاری رہتی ہیں۔

مجھے یاد ہے، کینیڈا کے شہر ٹورانٹو میں جشن گوپی چند نارنگ ہو رہا تھا۔ جشن تو نارنگ کا تھا مگر منایا شہر کے مقرروں نے۔ نارنگ کی زندگی پر روشنی ڈالنے والوں کا جو طومار بندھا تو اچھی بھلی زندگی تاریکی میں ڈوب گئی کیونکہ بالآخر جب نارنگ کے بولنے کی باری آئی تو وہ غریب نڈھال ہو چکے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ پھر بھی انہوں نے اپنی خطابت کو وقت کے راگوں میں ڈھالا اور خدا خدا کر کے ان کی زندگی پر روشنی پڑی۔

مشاعرے میں تو غضب یہ ہوتا ہے کہ اچھے شاعروں کے باری آخر میں آتی ہے اور حاضرین مشاعرہ کے صبر کو جب تک اچھی طرح آزمانہ لیا جائے، اچھا کلام سننے کو نہیں ملتا۔ بیچ بیچ میں کبھی کبھار کچھ نوآموز شاعر قیامت کے شعر پڑھ جاتے ہیں تو حاضرین آلو کے چپس کھانا چھوڑ کر غزل سننے لگتے ہیں ورنہ کیسا مشاعرہ اور کہاں کا مشاعرہ۔ اچھی بھلی پکنک کا سماں ہوتا ہے۔ مشاعرہ چونکہ رات بھر کا ہوتا ہے، لوگ ناشتے دانوں میں کباب پراٹھے بھی لے آتے ہیں۔ غنیمت ہے کہ جو نہاری کھانے کا وقت ہوتا ہے، وہی سینئر شاعروں کے سننے کے لمحات ہوتے ہیں۔ یوں نہ ہوتا تو شاعر کم چہکتے، دیگیں زیادہ کھنکتیں۔

ایک اور مسئلہ کتاب کی رسم اجرا کا ہے۔ ادھر کوئی شعری مجموعہ اور افسانوں کا مجموعہ چھپا، ادھر اس کی رسم اجرا کی نیتیں باندھی جانے لگیں۔ پہلے تو اس کو رسم رونمائی کہتے تھے۔ پھر شاید کسی نے یہ بات بجھائی کہ رونمائی تو نئی دلہن کی ہوا کرتی ہے۔ مگر اس میں فائدہ یہ تھا کہ دلہن کتنی ہی بدشکل کیوں نہ ہو، رونمائی کے وقت کوئی یہ بات نہیں کہتا تھا۔ غالباً اسی لئے صاحب کتاب اس تقریب کو رونمائی کا نام دے کر ایک بڑے خطرے کو ٹال دیتے تھے۔

مگر نام میں کیا رکھا ہے۔ اب رسم اجرا کا اصول بھی یہ ہے کہ پوری رسم تعریف سے شروع ہو اور توصیف پر ختم ہو۔ ہمارے ایک بڑے دانش ور نے جمالیات کے موضوع پر چار پانچ نہایت دقیق اور اعلیٰ علمی کتابیں شائع کرائیں۔ ہم نے ان کی رسم اجرا میں کہیں یہ کہہ دیا کہ پہلے

جمالیات کی مبادیات تو سمجھا دی ہوتیں اور ایک ابتدائی کتاب لکھ کر ہم مبتدی لوگوں کو کچھ بنیادی نکتے سمجھا دئے ہوتے، اس کے بعد ہم فرانسیسی مدبروں کی تحریروں کا ترجمہ پڑھتے۔

وہی ہوا جو ہونا تھا۔ وہ برا مان گئے۔

لندن میں ایک عفیفہ افسانے لکھا کرتی ہیں۔ اپنی استعداد بھر لکھتی ہیں اور اپنے خرچ سے ان کا مجموعہ بھی چھپوا لیتی ہیں۔ ان کے ایسے ہی ایک مجموعے کی رسم اجرا بھی ہوئی۔ اچھا ہوا۔ لیکن مقرر اپنا طے شدہ فرض ادا کرنے سے نہیں چوکے۔ ایک مقرر نے کہا کہ ان افسانوں میں مصنفہ ہیمنگ وے سے مکالمہ کرتی نظر آتی ہیں۔

کینیڈا میں ایک کتاب کی رسم تعارف ہوئی۔ تقریر کے لئے پاکستان سے ایک شعلہ بیان خاتون بلائی گئیں۔ انہوں نے بھی اپنا فرض نبھایا اور کہا کہ یہ کتاب تو ایسی ہے کہ اسے درمیان میں رکھ کر اس کا طواف کیا جانا چاہئے۔

ادب اور خصوصاً شاعری میں غلو سمجھ میں آتا ہے مگر رسم اجرا میں تو قیامت کا غلو ہوتا ہے۔ رسم کا دولہا اگر شاعر ہو تو بات میر تقی میر سے شروع ہوتی ہے اور غالب، اقبال اور فیض کے راستے چلتی ہوئی موصوف پر ختم ہوتی ہے۔ یہی حال افسانہ نگاروں کا ہے۔ تقریریں سن کر محسوس ہوتا ہے کہ بس افسانہ نویسی آج اپنے عروج کو پہنچی ورنہ اس پر زوال ہی زوال تھا۔

ایک صاحب کے افسانوں کے مجموعے کی تقریب تھی۔ انہوں نے ہمارے ایک دوست کو خدا جانے کس طرح تقریر پر رضا مند کر لیا۔ دوست ایسے کہ غلو سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ اسٹیج پر گئے۔ پہلے تو مصنف اور ان کے بال بچوں کے بارے میں چند باتیں کہیں، اور جب کتاب پر کچھ کہنے کی باری آئی تو یہ کہہ کر اسٹیج سے اتر گئے کہ یہ اپنی نوعیت کی ایک ہی کتاب ہے اور میں نے ایسی کتاب پہلے کبھی نہیں پڑھی۔

مصنف اور ان کے بہی خواہوں نے خوش ہو کر بہت تالیاں بجائیں۔

شعری اور افسانوی مجموعوں کے بعد آتا ہے سفر نامہ۔ اس کی تو بات ہی نہ کی جائے تو اچھا ہو۔ ہم یہاں لندن میں رہتے ہیں اور جوں ہی اپنی طرف کے کسی اہل قلم کو سڑکوں پر گھومتا

دیکھتے ہیں، خود ہی سے کہتے ہیں کہ لیجئے سنبھلئے۔ ایک اور سفرنامہ آنے کو ہے۔ نیویارک، لندن اور ہندوستان کے سفرنامے پڑھ پڑھ کر اب تو جی متلانے لگا ہے۔ کبھی یہ نہیں دیکھا کہ کسی نے زمبابوے کا سفرنامہ لکھا ہو یا منگولیا کے سفر کا احوال قلم بند کیا ہو جہاں میرے ایک واقف کار گئے تھے اور بتا رہے تھے کہ وہاں خیمے کو گھر کہتے ہیں۔ وہاں چنگیز خان کے زمانے سے یہ رسم چلی آ رہی ہے کہ ہر نئی بیوی کو ایک مکان فراہم کرتے ہیں اور اس مکان کو اُردو کہتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ منگولوں کے جس علاقے پر کمیونسٹوں کا تسلط تھا وہاں ایک قانون نافذ کر دیا گیا تھا کہ کوئی اپنے نام کے ساتھ اپنا خاندانی نام نہیں لگائے گا۔ نام ساتھ لگانے کا یہ سلسلہ اتنے عرصے موقوف رہا کہ لوگ اپنے بزرگوں کے نام بھول گئے۔

ابھی تازہ خبر آئی ہے، جو اگرچہ اس تحریر کے دائرے سے باہر ہے لیکن چونکہ ہمارا کوئی سفرنامہ نگار نہیں لکھے گا اس لئے لکھ دینے کا یہی مقام ہے۔ خبر یہ ہے کہ منگولیا کی نئی حکومت نے لوگوں کو شناختی دستاویز جاری کرنے کے لئے ہدایت کی ہے کہ وہ اپنا کوئی خاندانی نام رکھیں۔ خبر ہے کہ ان گنت لوگوں نے اپنے نام کے ساتھ 'تموچن' کا نام جوڑ دیا ہے۔ چنگیز خان کا نام۔

سوچتا ہوں کہ ہمارے سفرنامہ نگاروں کی فوج ظفر موج میں ایک بھی جیالا ایسا نہیں جو منگولیا جائے، وہاں کا سفرنامہ لکھے اور لکھے کہ وہاں کے ریگستانوں میں جب ہوا چلتی تھی تو سناٹے میں ساز بجنے کی آوازیں آتی تھیں لیکن جب سے دنیا کی فضا میں کثافت بڑھی ہے، ریگستانوں نے چپ سادھ لی ہے۔

لوگ سفرنامے لکھتے ہیں، ضرور لکھیں۔ مگر اپنی بات کہنے کا ایک پیمانہ ضرور مقرر کریں۔ مثلاً یہ طے کریں کہ ان کی کس بات سے قارئین کو کیا غرض۔ کس کی خالہ کے گھر ضیافت میں کیا کھلایا گیا اور کس کے ہم زلف کے بچوں نے نرسری کے کون کون سے گیت سنائے۔ لوگ بے تکان اپنا روزنامچہ لکھے چلے جاتے ہیں اور اپنے قاری سے توقع کرتے ہیں کہ وہ بھی ان کی خالہ کے حق میں دعائے خیر کرے گا اور ہم زلف کے بچوں کی درازیءعمر کے لئے سربسجود ہوگا۔

چند ایک کو چھوڑ کر یہ سفرنامہ نگار نہ تحقیق کرتے ہیں، نہ تفتیش۔ زیادہ سے زیادہ سیاحت

کے کتابچوں سے چند ایک باتیں نقل کر دیتے ہیں۔ یہ بھی غنیمت ہے۔ عمارتوں، سڑکوں، بازاروں، سواریوں اور مناظر کا بیان بھی قابل قبول ہے مگر جس کردار کو صاف چھوڑ جاتے ہیں وہ اس علاقے کا باشندہ ہے، اس کا حال کم سے کم کہتے ہیں کیونکہ حال کہنے کے لئے حال جاننا بھی ضروری ہے اور حال جاننے کے لئے لوگوں سے گھل مل کر ان سے باتیں کرنا بھی طے ہے۔ اب اس جوکھم میں کون پڑے۔

پشاور کے ایک صحافی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ برطانیہ کے سفر پر گئے اور واپسی پر انہوں نے اپنے سفرنامے میں اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ انگلستان کا بچہ بچہ انگریزی بولتا ہے۔

اس روایت میں بھی یقیناً مبالغہ ہے، لیکن جو مبالغہ بعض سفرنامہ نگار جنس مخالف کی نسبت سے کرتے ہیں اس کا احوال بچے بچے کو ازبر ہے۔ ہر ایک سفرناموں کا مذاق اڑاتا ہے اور ہر ایک کا اصرار ہے کہ سفرنامہ نگاروں پر ہر جگہ عورتیں ایک لمحے میں ہزار جان سے کیسے عاشق ہو جاتی ہیں، مگر سفرنامہ لکھنے والا بھی خوب ہے کہ سفر سے باز آ جائے مگر بلائے عشق میں گرفتار ہونے سے باز نہیں آتا۔ کسی سابق فوجی کا شعر ہے:

محبت بری ہے، بری ہے محبت
کہے جا رہا ہوں، کئے جا رہا ہوں

لفظ باز آنے کی تکرار کے پیش نظر ہر سفرنامہ نویس سے یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ بسلامت روی و باز آئی۔ یعنی سلامتی سے جا اور عشق سے باز آ۔

مشاعروں کی بود و باش

یہ حیدر آباد، دکن کا ذکر ہے۔ ۱۹۸۲ء اپنے خاتمے کے قریب تھا اور موسم سرد ہو چلا تھا۔ شہر میں جو مشاعرہ سال کے سال دھوم مچاتا ہے، اس مشاعرے کا دن آ پہنچا تھا۔ شنکر جی کے نام سے سچ پوچھئے تو یہ مشاعرہ نہیں، اچھا بھلا جشن ہوتا ہے۔

میں ان دنوں وہیں تھا۔ منتظمین کا جی چاہا یا ان کی کوئی مجبوری تھی کہ انہوں نے مجھے مشاعرے کا مہمان خصوصی بنا دیا اور پاکستان کے مشہور مصور صادقین آئے ہوئے تھے، شاعروں میں ان کا نام بھی شامل کر دیا گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ شہر میں دھوم مچ گئی کہ اب کے شنکر جی مشاعرہ بین الاقوامی ہو گیا ہے۔

شاعروں کے ساتھ لگا لگا میں مہمان خصوصی بھی ایک بڑے کمرے میں بٹھایا گیا جہاں تواضع کا سلسلہ جاری تھا۔ اتنے میں میری نگاہ سامنے سے گزرتے ہوئے ایک مجمع پر پڑی۔ ایک ہجوم تھا جو چلا جا رہا تھا۔ میں نے بڑی سادگی کے ساتھ کسی سے پوچھا کہ کیا کوئی سینما شو چھوٹا ہے؟ جواب ملا، جی نہیں، مشاعرے میں شرکت کے لئے پبلک آ رہی ہے۔

اب جو غور سے دیکھا تو احساس ہوا کہ پبلک تنہا نہیں آ رہی، بیویاں اور بچے تو خیر سے ساتھ میں ہیں، بغل میں تکئے، دریاں اور چادریں بھی ہیں۔

اس بار میں نے سادگی کے ساتھ کسی سے کچھ نہیں پوچھا اور خود ہی طے کرلیا کہ اگر کلام اکتانے والا ہوا تو حاضرین وہیں بستر لگا کر سو رہیں گے، اس سہولت کا بندوبست وہ گھر سے ہی کر کے چلے ہیں۔

بڑا اسٹیج سجایا گیا تھا، سامنے کھلا ہوا میدان تھا کہ اس میں جہاں تک نگاہ جاتی تھی، سامعین اس سے بھی آگے تک بیٹھے تھے۔ رات بھر گل و بلبل کے قصے سننے کے لئے اتنے بہت سے لوگوں کا جمع ہو جانا جس قدر حیران کر رہا تھا، اس سے زیادہ پریشان کر رہا تھا۔

مشاعرہ شروع ہوا اور اس شان سے ہوا کہ شروع ہوتے وقت کسی نے گھڑی دیکھی ہو تو دیکھی ہو، اس کے بعد لوگوں نے پھر افق پر نمودار ہوتا سپیدۂ سحر ہی دیکھا۔

اب سمجھ میں آیا کہ لوگ ہمراہ دریاں بچھانے کے لئے لائے تھے، تکئے اور کشن نیچے رکھ کر ان کے اوپر بیٹھے تھے اور چادروں کا مصرف کچھ زیادہ ہی دلچسپ نکلا۔ جب ٹھنڈک بڑھی اور اوس گرنے لگی تو گھر سے یہ سامان لانے کا بھید کھلا۔ کچھ بیزار کن غزلیں پڑھی جا رہی تھیں، ذرا دیر کے لئے میری آنکھ لگ گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مشاعرے کا میدان خواتین سے بھر گیا ہے۔ وہ عالمِ خواب نہ تھا۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ اوس اور ٹھنڈک سے بچنے کے لئے بہت سے حضرات نے چادریں اوڑھ لی تھیں۔

ویسے باکمال مجمع تھا جس نے ایک سے ایک کمزور شعر سنا لیکن ایک بار بھی ہوٹنگ نہیں کی۔ صادقین کے قطعات تک خاموشی سے سن لئے۔ مجمع کی سخن فہمی کی طرف سے دل کو دھڑکا لگنے ہی والا تھا کہ اس نے اچھے شعروں پر داد دینی شروع کر دی اور اچھے شاعروں کی توقیر بڑھائی تب کہیں جا کر میرا دل ٹھہرا۔

لیکن اس مجمع نے جیسی توقیر مجھے بخشی، کس کو بخشی ہوگی۔ ہوا یہ کہ منتظمین مشاعرہ نے غالباً مہمان خصوصی کی نشست سنبھالنے کے لئے پہلے پہل عصمت چغتائی سے وعدہ لے لیا تھا۔ میں

نے شہر کی دیواروں پر جو بڑے بڑے پوسٹر چسپاں دیکھے ان سب پر عصمت چغتائی کا نام تحریر تھا۔ مجھے بھی اشتیاق تھا کہ عصمت آپا کو قریب سے دیکھیں گے۔ پھر نمعلوم کس لمحے یہ خبر آئی کہ محترمہ نہیں آ رہی ہیں۔ منتظمین نے قرعہ ڈالا یا نہیں لیکن ہوا یہ کہ میرا نام نکلا۔ مجھے اتنے بڑے مشاعرے کا مہمان خصوصی بنا دیا گیا اور وہ بھی عصمت چغتائی کی جگہ۔ اس سے بڑھ کر توقیر کیا ہوگی۔ مگر نہیں۔

مشاعرے کی کارروائی شروع ہوئی۔ سامنے ہزارہا کا مجمع کارروائی کو کتنے دھیان سے سن رہا تھا، اس کا علم ذرا دیر بعد ہو گیا۔ ہوا یہ کہ ناظم مشاعرہ نے مائیکروفون پر آ کر اعلان کیا۔

''خواتین و حضرات، اس یادگار مشاعرے کے مہمان خصوصی ہیں جناب عابد علی رضا۔''

ان کا یہ کہنا تھا کہ پورا مجمع بیک آواز اگرچہ زیر لب بولا لیکن سب کی آوازیں ملیں تو انہیں راہ دینے کے لئے بادلوں کو ہٹنا پڑا۔

جوں ہی ناظم مشاعرہ نے کہا ''عابد علی رضا۔''

سارا مجمع بولا۔ ''رضا علی عابدی''۔

اُس رات میں نے توقیر سمیٹی تو میرا دامن تنگ نکلا۔

ہندوستان کی ریاست ہریانہ میں اگرچہ اب مسلمان کم ہی رہ گئے ہیں مگر اردو کا چلن باقی ہے۔ اردو کی انجمنیں اور تنظیمیں بھی ہیں اور مشاعرے بھی ہوتے ہیں۔ وہیں کچھ بزرگوں نے ایک بار مجھے بتایا کہ اگلے وقتوں میں مشاعرے کے مخصوص آداب تھے۔ مثلاً لوگ جس پہلو بیٹھتے تھے، آخر تک اسی پہلو بیٹھنا ضروری تھا اور مشاعرے کے دوران پہلو بدلنا خلاف آداب سمجھا جاتا تھے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ حاضرین مشاعرہ دامن میں پھول بھر کر بیٹھتے تھے اور اچھے شعر پر شاعر کو نہ صرف داد دیتے تھے بلکہ اس پر پھول بھی برساتے تھے۔

مشاعرہ اردو روایت کی رگِ جاں ہے۔ غزل اردو زبان کی آبرو ہے اور سامع کمزور یادداشت والا وہ مجمع ہے کہ سو مرتبہ کا سنا ہوا شعر بھول جاتا ہے اور ہر بار نئے سرے سے داد دیتا

ہے۔ بعض اوقات شاعر بڑی معذرت خواہی کے انداز میں کہتے ہیں کہ معاف کیجئے، یہ غزل جو میں پڑھنے والا ہوں آپ نے پہلے بھی سنی ہوگی، لیکن حاضرین ہر شعر پر یوں پھڑک اٹھتے ہیں جیسے ابھی ابھی سرزد ہوا ہے۔

شاعروں میں ایک خوبی اور بھی ہے۔ پڑھنے سے پہلے کہیں گے کہ ایک غزل کے دو شعر۔ لیکن گیارہ سے کم نہیں سناتے۔ اور اگر کہیں شاعروں پر منتظمین مشاعرہ پابندی لگادیں کہ وقت کم ہے اور کوئی شاعر پانچ سے زیادہ شعر نہ پڑھے تو یہ ظالم غزل چھوڑ کے نظم پڑھنے لگتے ہیں جس میں یا تو شعر ہی نہیں ہوتے اور اگر ہوتے ہیں تو انہیں درمیان سے چھوڑا نہیں جاسکتا۔ اور اگر انہیں احساس ہو جائے کہ وقت کم ہے اور منتظمین مشاعرہ مضطرب ہیں تو غزل سے پہلے تقریر شروع کردیتے ہیں۔ اس وقت ان کے چہرے پر اطمینان اور سکون قابل دید ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر یہ اعلان ہو جائے کہ ہر شاعر کو پانچ پانچ منٹ ملیں گے تو وہ اونچے سروں میں ترنم سے پڑھنے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چار منٹ کی غزل سترہ منٹ سے ادھر ختم نہیں ہوتی۔

کچھ بھی ہو، موسیقی میں قوالی لوگوں کو اپنی طرف اس طرح نہیں کھینچتی جیسے شعر و ادب میں غزل کھینچتی ہے۔ ہم نے آج تک ایسا عظیم الشان مجمع نہیں دیکھا جس میں افسانے پڑھے جارہے ہوں یا تنقیدی اور تحقیقی مضامین سنائے جارہے ہوں۔

عظیم الشان مجمع پر مجھے کراچی کا وہ مشاعرہ یاد آیا جس کا اہتمام اخبار ڈان نے کیا تھا اور جسے اپنے وقت کے بڑے مزاح نگار مجید لاہوری نے عظیم الڈان مشاعرے کا نام دیا تھا۔ حضرت عیسیٰ کی ولادت کو ۱۹۵۰ سال ہو رہے تھے، روزنامہ ڈان نے کراچی کے سندھ مدرسے میں ایک بڑے ہندو پاک مشاعرے کا اہتمام کیا۔ دور دور سے بڑے بڑے نامی گرامی شاعر آئے تھے لیکن زہرا نگاہ نام کی ایک لڑکی چوڑے عرض کے دوپٹے میں لپٹی لپٹائی اسٹیج پر آئی اور مشاعرہ لوٹ کرلے گئی۔

شہر کراچی کی اپنی کوئی روایت نہیں۔ یہ شہر اُس طرح کی ریت اور رسم سے محروم ہے جو صدیوں سے اپنی جگہ ٹھہری ہوئی بستیوں میں گھر کرلیا کرتی ہیں۔ بس لے دے کر ایک یا دو بڑے

مشاعرے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک شہر قائد کا مشاعرہ کہلاتا ہے۔ عشا کے بعد شروع ہوتا ہے اور فجر سے ذرا پہلے ختم ہوتا ہے۔ کبھی اس میں شاعر اور سامعین آتے تھے۔ اب وزیر، سفیر، پیر، منکر اور نکیر آتے ہیں جن کے ساتھ ان کی سکیورٹی بھی آتی ہے، بالکل ویسے ہی جیسے بعض دادخواہ شاعر اپنے ساتھ اپنے ہی داد دہندہ لاتے ہیں۔ بس اب اگر کراچی کی کوئی روایت ہے تو یہی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اگرچہ اردو پاکستان کی زبان تصور کی جاتی ہے مگر اردو مشاعرے پاکستان سے باہر زیادہ ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے مشاعروں کا تو قصہ ہی الگ ہے۔ وہاں تو شہر شہر اور نگر نگر شعر گوئی کی محفلیں ہوتی ہیں۔ انبالہ سے کیرالہ تک اتنے مشاعرے ہوتے ہیں کہ بعض شاعروں کے بارے میں مشہور ہے کہ اپنے گھروں پر کم ملتے ہیں۔ ایک بار معلوم ہوا کہ سارے شاعر اپنے ٹھکانوں سے غائب ہیں، پتہ چلا کہ مشاعرہ پڑھنے آسام گئے ہوئے ہیں۔

مشاعرہ ٹوکیو میں ہو یا ٹمبکٹو ہو، ایک غضب یہ ہوا ہے کہ شاعروں کی صفوں میں خوش گلو اور بعض اوقات خوش شکل خواتین بھی کہیں سے آ کر شامل ہو گئی ہیں۔ وہ اپنے اشعار سے زیادہ اپنی اداؤں کی داد پاتی ہیں اور یہ سلسلہ مجرے کے بعد تک چلتا ہے۔

ایک بار مجھے خلیج کی ایک ریاست کے مشاعرے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ کسی وجہ سے زیادہ تر شاعر ہندوستان سے بلائے گئے تھے۔ وہ تو اپنے پاجامے اور شیروانیاں پہنے ہاتھوں میں پان کی ڈبیا اٹھائے آ گئے۔ لیکن وہ جو ریشم واطلس وکمخواب میں ملبوس ہاتھوں میں میک اپ باکس اٹھائے شاعرائیں آئیں، ایسی تھیں کہ بس دیکھا ہی کیجئے۔ اوپر سے ذرا شوخ اور تھوڑی چنچل، نوعمر شاعروں کے ساتھ چہلیں کرتی ہوئی، اہلی گہلی چلتی ہوئی، ترنم سے غزلیں پڑھتی ہوئی اور بدذوق حاضرین کی داد پر اتراتی ہوئی یہ بھی عجب مخلوق تھی۔

مجھے یقین تھا کہ اس حلئے والی عورتیں اس طرح کے سنجیدہ شعر نہیں کہہ سکتیں۔ میں نے کسی سے پوچھا کہ کیا یہ شعر خود کہتی ہوں گی۔ جواب ملا ''اجی توبہ کیجئے۔ انہیں تو سارے شعر فلاں بھوپالی لکھ کر دیتے ہیں۔''

اب میں نے ایک اور صاحب سے تصدیق چاہی۔ ''کسی نے بتایا ہے کہ ان عورتوں کو

یہ سارے شعر فلاں بھوپالی لکھ کر دیتے ہیں۔''

جواب ملا۔''ذرا ان صاحب سے یہ بھی پوچھیے یہ خود فلاں بھوپالی کو شعر لکھ کر کون دیتا ہے۔''

سچ ہے، چراغ سے کبھی کبھی موم بتی بھی جلتی ہے۔

مشاعروں کے معاملے میں عرب ریاستوں سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ اونٹوں کی دوڑ، شاہینوں کی اڑان اور کرکٹ کے میچوں کے بعد شیوخ کا پسندیدہ مشغلہ یہی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جس مشاعرے کا احوال مجھے ہمیشہ یاد رہے گا وہ جنوبی افریقہ کے کسی شہر، غالباً ڈربن میں ہوا تھا۔

اُن دنوں ہمارے بی بی سی کے ساتھی مجیب صدیقی جنوبی افریقہ گئے ہوئے تھے۔ وہاں کچھ صاحب حیثیت حضرات کو خیال آیا کہ کیوں نہ برصغیر سے کسی شاعر کو بلا کر مشاعرہ کرایا جائے۔ شرط یہ تھی کہ شاعر سُریلا ہو۔ قرعہ فال کراچی کے قاسم پیرزادہ کے نام نکلا۔ اب کسی کو یہ خیال آیا کہ اکیلا چنا تو کچھ کر سکتا ہے لیکن ایک اکیلے شاعر سے مشاعرہ تو نہیں ہو سکتا۔ ایک سے زیادہ شاعر ہوں تو بات بنے۔ اب سوال یہ اٹھا کہ دوسرا شاعر کہاں سے لایا جائے۔ پورے علاقے میں کوئی دوسرا شاعر نہ تھا۔ کسی کی نگاہِ انتخاب مجیب صدیقی پر پڑی جنہوں نے زندگی میں کبھی کوئی مصرعہ بھی موزوں نہیں کیا تھا۔ لوگ پیچھے پڑے کہ جیسے بھی بنے، کم سے کم دو غزلیں کہیے تا کہ سینئر شاعر سے پہلے پڑھنے کے لئے کوئی جونئر شاعر بھی تو ہو۔

مجیب مان گئے۔ کہتے ہیں کہ میں نے دو راتیں جاگ کر گزاریں اور اس افریقی گھر کے برآمدے میں ٹہل ٹہل کر دو غزلیں ایسے حالات میں کہیں کہ رات بھر جنگلی جانوروں کی آوازیں کانوں میں پڑتی رہتی تھیں۔

انہوں نے اپنی وہ غزلیں ہمیں کبھی نہیں سنائیں۔ اب خیال آتا ہے کہ ان سے ایسی ہی وحشت برستی ہوگی کہ نہیں سنائیں۔

ایک اور مشاعرہ میرے دل و دماغ میں آباد ہے، وہ نیویارک کا مشاعرہ تھا۔ وہاں

شاعروں کی کمی نہیں بلکہ اتنے زیادہ ہیں کہ کئی گروہوں میں بٹ گئے ہیں اور ایک گروہ چار رکعت کی نیت باندھتا ہے تو دوسرا اس کی ضد میں آٹھ رکعت کی نیت باندھتا ہے۔

بڑا اچھا مشاعرہ تھا۔ ایک بڑے، کشادہ اور دومنزلہ طعام خانے کی بالائی منزل مشاعرے کے لئے مخصوص تھی۔ زیریں منزل میں ایک مسلمان لڑکے اور ہندو لڑکی یا شاید مسلمان لڑکی اور ہندو لڑکے کی شادی ہو رہی تھی۔ اوپر کی منزل کو بہت سی کرسیوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ میں حیران تھا کہ اتنے بہت سے حاضرین کہاں سے آئیں گے۔ ذرا دیر بعد مجھے میری حیرت کا جواب مل گیا۔ پورے پورے کنبے، بال بچوں سمیت آپہنچے اور سارا ہال بھر گیا۔

لندن میں ہم نے یہ منظر کبھی نہیں دیکھا۔ یہاں اردو کی محفلوں میں بچے اور نوجوان نہیں آتے۔ وہاں جو آئے اور کرسیوں پر براجمان ہوئے تو اس شان سے کہ رات دیر تک بیٹھے رہے۔ نیند سے آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں لیکن ذرا بیدار ہوتے تھے تو باقی مجمع کی دیکھا دیکھی واہ وا کی صدا بھی لگاتے تھے۔ شاعر تھے کہ بھاری بھرکم غزلیں اور ان سے بھی زیادہ وزنی نظمیں سنائے جا رہے تھا اور ان غریب بچوں پر کسی نے جو ترس کھایا ہو۔

مجھے مشاعرے کا صدر بنایا گیا تھا، خدا جانے کیوں، میں تو شاعر نہیں۔ لیکن جب آخر میں میری باری آئی تو میں نے ضد میں ان تمام شعرا کی، حاضرین کو بچوں کی نظمیں سنائیں۔ بچے سنبھل کر بیٹھ گئے، پورا ماحول کھل اٹھا، جیسے فضا کے سارے رنگ بدل گئے ہوں۔

میں نے آخر میں اپنے صدارتی کلمات میں شاعر حضرات سے کہا کہ کبھی بچوں کے لئے بھی لکھ دیا کیجئے اور شکر ادا کیجئے کہ بچے آپ کی محفلوں میں آتے ہیں۔ ان کی دل چسپی کا سامان نہ ہوا تو ذرا سی خودمختاری ملتے ہی یہ آنا چھوڑ دیں گے اور نیچے کی منزل میں ملی جلی شادیاں کرتے رہیں گے۔

میری اس بات پر مجمع پہلے ہنسا۔۔۔۔۔۔اور پھر ہنسا۔

راغب مرادآبادی اور رئیس امروہوی مرحوم سے زیادہ زودگو شاعر کون ہوگا۔ بچوں

کے ایک اسکول میں کھانے کی ضیافت تھی۔ راغب مراد آبادی مہمان خصوصی تھے اور آخر میں انہیں دو چار باتیں کہہ کر اپنی رسمی تقریر کرنی تھی۔ اب جو وہ کھڑے ہوئے تو بچوں نے صدا لگائی۔ ''منظوم۔ منظوم''۔ چنانچہ راغب صاحب نے ہاتھ کے ہاتھ منظوم تقریر کردی۔

رئیس صاحب کے قلم سے شعر ٹپکتے تھے۔ شہر کے نوجوان مشاعروں میں پڑھنے کے لئے ان سے غزلیں لکھوا کر لے جاتے تھے۔ ایک بار ایسے ہی ایک نوجوان نے، جو کسی طرح سے بھی شاعر نہیں لگتا تھا، پیچھے پڑ کر رئیس صاحب سے غزل لکھوالی اور رات کو اسی مشاعرے میں سنانے پہنچ گیا جس میں رئیس صاحب بھی موجود تھے اور وہیں اسٹیج پر بیٹھے تھے۔

اس لڑکے نے غضب یہ کیا کہ غزل اپنے ہاتھ سے بھی نہیں لکھی بلکہ رئیس امروہوی صاحب کے ہاتھ کی تحریر لے کر پڑھنے لگا۔

پڑھتے پڑھتے اس نے ایک مصرعہ کچھ یوں پڑھا

اے کہ تیری حَپّوں سے برہمی برستی ہے

سارے مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ کہیں سے آواز آئی، پھر سے پڑھئے میاں صاحب زادے۔ مصرعہ پھر سے پڑھا گیا۔

اے کہ تیری حَپّوں سے برہمی برستی ہے

اِس بار کئی آوازیں ابھریں۔ واہ وا۔ مکرر ارشاد

اُس نے پھر پڑھا اور زیادہ لہک کر پڑھا

اے کہ تیری حَپّوں سے برہمی برستی ہے

بس پھر کیا تھا۔ مجمع نے یہ مصرعہ بار بار پڑھوانا شروع کیا اور شاعر کی سرشاری بڑھتی گئی۔ قریب ہی اسٹیج پر بیٹھے ہوئے رئیس امروہوی صاحب پہلے تو کھنکھارتے رہے، آخر ان سے نہ رہا گیا اور مصرعے کو درست کرتے ہوئے بولے

اے کہ تیری چتون سے۔۔ چتون سے۔۔

اس پر شاعر کی باچھیں کھل اٹھیں اور رئیس صاحب کی طرف منہ کر کے بولا۔ ''رئیس

صاحب، چتون بھی ٹھیک ہوگا مگر جَپّوں بھی مزا دے رہا ہے۔''

ہمارے شاعروں کو ہوٹنگ سے بچنے کے بھی سارے ہی گر آتے ہیں۔ جہاں دیکھا کہ مجمع غیر سنجیدہ ہے اور آوازے کس رہا ہے، جھٹ کربلا کے موضوع پر شعر پڑھنے لگتے ہیں۔ علی گڑھ کے ایک مشاعرے کے بارے میں سنا ہے کہ لڑکوں نے شاعروں کا جینا دوبھر کر رکھا تھا۔ ہر شاعر پر ہوٹنگ کر رہے تھے اور ہر نظم اور غزل کا تماشا بنا رکھا تھا۔

اتنے میں ایک شاعر اسٹیج پر تشریف لائے اور بیاض کھول کر نعت رسول مقبولؐ پڑھنے لگے۔ لڑکوں کا مجمع خاموش ہوگیا یہاں تک کہ لوگوں کی سانسیں سنائی دینے لگیں۔ ادھر ہر مصرعہ پر شاعر کی فاتحانہ اتراہٹ بڑھتی گئی۔ اچانک ایک کونے سے ولولہ اٹھا۔ کسی نے صدا لگائی۔ ''نعرۂ تکبیر۔'' اور پھر جب تک مشاعرہ جاری رہا، اللہ ہو اکبر کے نعرے گونجتے رہے۔

ایک بار لندن میں حیدرآباد دکن ایسوسی ایشن نے ایک مشاعرہ کرایا۔ انہوں نے اصرار کیا کہ مشاعرے کی نظامت میں کروں۔ میں نے کہا کہ مجھے شاعروں کی بھرمار بہت پریشان کرتی ہے، مجھے رہنے ہی دیجئے۔ انہوں نے کہا کہ صرف بارہ شاعر ہوں گے اور وہ بھی معروف۔ ان کی فہرست دیکھی تو مجھے نظامت پر آمادہ ہوتے ہی بنی۔ بارہ اعلیٰ شاعر نہایت عمدہ کلام سنائیں گے تو کتنا اچھا لگے گا۔ میرے اندر کا بچہ جھوم اٹھا لیکن باہر کے بالغ کے سینے میں کوئی چیز پھانس بن کی چبھ رہی تھی۔ اس کا راز اُس وقت کھلا جب عین مشاعرے سے پہلے میرے ہاتھ میں شاعروں کی حتمی فہرست تھمائی گئی۔ کہاں اس میں بارہ نام تھے، کہاں ان کی تعداد خطرے کے نشان سے بھی اوپر ہو کر ڈیڑھ درجن تک جا پہنچی۔ میں نے سخت احتجاج کیا اور چیخا چلایا کہ اس فہرست میں یہ گھاس پھوس کیوں ٹھونس دی گئی۔ کہنے لگے کہ شاعروں نے نیندیں حرام کر دی تھیں۔ راتوں کو ٹیلی فون کر کے جگاتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم اگرچہ دکن کے نمک خوار نہیں لیکن وفادار بہت ہیں، ہماری حق تلفی کی گئی تو نظام حضور کی روح قبر میں تڑپے گی۔

اب اس موقع پر صبر کے سوا اور چارہ بھی کیا تھا۔ مگر یہ صبر بھی ایک سراب نکلا۔ مشاعرہ شروع ہونا تھا کہ مجمع میں سے پرچیاں آنی شروع ہوئیں، ''یہاں فلاں سہارنپوری بیٹھے ہیں، فلاں کانپوری تشریف فرما ہیں، انہیں ضرور پڑھوایا جائے''۔ یا یہ کہ یار عابدی، ہم بھی ہیں پانچوں سواروں میں۔

لیکن اس شام کا سب سے کاری زخم غیروں نے نہیں اپنوں نے لگایا۔ کراچی سے کوئی شاعر آیا ہوا تھا جس کا ایک بازو جمال احسانی نے اور دوسرا افتخار عارف نے تھام رکھا تھا۔ دونوں مجھ سے بولے کہ عابدی بھائی، یہ ایسے شاعر ہیں کہ آج قیامت برپا ہو جائے گی۔ آپ کو یاد ہے، دلی کے مشاعرے میں جس طرح افتخار عارف کو پہلی بار پیش کیا گیا تھا تو کیا دھوم مچی تھی۔ یہ بھی اسی پائے کے شاعر ہیں، ذرا زوردار تعارف ہو جائے۔

میں نے اتنا پرزور تعارف کرایا اور قیامت جگانے والے شاعر کی شان میں ایسی تمہید باندھی کہ پس منظر میں جمال احسانی اور افتخار عارف کی دبی دبی ہنسی بھی سنائی نہ دی۔

وہ کراچی کا شاعر مائیکروفون پر آیا اور اب جو اس نے بقول میر تقی میر گوذ بھرے شعر پڑھنے شروع کیے تو جی چاہا کہ حاضرین مشاعرہ کی اجازت لئے بغیر خود کو دریائے ٹیمز کی موجوں کے حوالے کر دوں۔

ایک دور ایسا بھی آیا کہ لندن والوں پر تابڑتوڑ مشاعرے ٹوٹنے لگے اور کچھ لوگوں نے تجویز رکھی کہ ایک انجمن بنائی جائے جس کا نام ہو' انجمن انسدادِ بے رحمی بر سامعینِ مشاعرہ'۔ اس میں مسئلہ یہ تھا کہ بے رحمی کے مجرموں پر چالان کون کرے گا کیونکہ خود اس کے بھی شاعر ہونے کا خطرہ ہے۔

یوں لندن کے مشاعروں کا حال خدا بیان نہ کرائے۔ یہاں جب کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا وہ مشاعرہ کرا دیتا ہے۔ بعض لوگوں کا تعارف یہ کہہ کر کرایا جاتا ہے کہ برطانیہ میں اردو کی بڑی خدمت کر رہے ہیں۔ اور جب پوچھا جائے کہ کس طرح ؟ تو جواب ملتا ہے کہ مشاعرے کراتے ہیں۔

ایک بار برطانیہ میں آباد سرکردہ شاعروں کے بارے میں ایک کتاب شائع ہوئی۔ پورے ۷۲ شاعر تھے۔ ہر ایک کے احوال اور نمونہء کلام کے ساتھ اس کی تصویر بھی تھی۔ دو ایک کے سوا ہر ایک نے اپنی کالج کے زمانے کی تصویر چھپوائی۔ ایک خاتون نے تو دوپٹے کا کونا دانتوں میں دبا رکھا تھا۔

کتاب کی رسمِ اجرا بھی مشاعرے کی شکل میں ہوئی۔ کیسا عجب اتفاق تھا کہ اس کی نظامت مجھی سے کرائی گئی۔ کتاب میں جن شاعروں کا ذکر تھا قریب قریب سبھی آئے تھے اور داد دینے والوں کا مجمع ساتھ لائے تھے۔ میں اسٹیج پر بیٹھا بیٹھا ایک عجیب منظر دیکھا کیا۔ شاعر اپنا کلام ختم کرتے ہی اپنے مداحوں کے جھرمٹ کو ساتھ لے کر جلسہ گاہ سے چلا جاتا۔

جیسے جیسے شاعر بھگت رہے تھے، مجمع گھٹتا جا رہا تھا۔ آخر میں میرے علاوہ میری اہلیہ اور وہ دو حضرت رہ گئے جن کی سواری کا انتظام نہیں تھا اور جنہیں میری ہی کار میں واپس جانا تھا۔

اب مجھے اختتامی تقریر کرنی تھی اور حاضرین محفل کا شکریہ بھی ادا کرنا تھا۔ میں نے مائیکروفون سنبھالا کہ میری طرح جس کی نبضیں بھی ڈوب چلی تھیں اور کہا کہ خواتین و حضرات۔ لیجئے، تاریخ کی مختصر ترین تقریر سنئے۔ "شکریہ"

ایک اور صاحب آئے دن اپنے کلام کے مجموعے شائع کراتے رہتے ہیں اور ہر مجموعے کی اشاعت پر مشاعرہ بھی کراتے ہیں جس میں ایک بار اپنی پوری بیاض سنا دی تھی۔ باقی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں، بس یوں سمجھ لیجئے کہ ان کے تازہ مجموعے کا نام ہے 'کچھ کچھ ہوتا ہے'۔

ایک بزرگ شاعر ہر مشاعرے میں اس ٹھسے سے آتے تھے کہ ہاتھ میں موٹی سی چھڑی ہوتی تھی اور ساتھ میں کیمرہ لئے ان کا بیٹا ہوتا تھا۔ بیٹا یوں تو بیٹھا اونگھتا رہتا تھا لیکن جوں ہی ابا جان شعر پڑھنے کھڑے ہوتے، وہ حرکت میں آجاتا اور تصویروں پر تصویریں اتارتا رہتا۔ ابا جان بھی ایسے تھے کہ اپنی نشست پر جم کر نہیں بیٹھتے تھے بلکہ مختلف بہانوں سے ادھر ادھر آتے جاتے

رہتے تھے تا کہ کہیں انہیں شروع ہی میں نہ بلا لیا جائے۔

ایک بار اپنے مخصوص ترنم میں غزل کا پہلا شعر پڑھا اور اسی ترنم میں لہک کر اس کی تقطیع بھی کر دی

فاعلن فاعلن عاعلن فاعلن

بس پھر غضب ہو گیا۔ جوں ہی وہ شعر مکمل کرتے، سارا مجمع اُسی ترنم میں اور قوالی کے انداز میں اس کی تقطیع کرنے لگتا۔ وہ پہلے تو محظوظ ہوئے، پھر خفا، پھر ناراض، پھر برہم اور آخر چھڑی اٹھائی، بیٹے کا ہاتھ تھاما اور محفل سے اس بڑھیا کی طرح نکل گئے جو اپنا مرغ بغل میں داب کر گاؤں سے چلی گئی تھی۔ لیکن مقطع سنائے بغیر نہیں گئے۔

شاعروں کی ایک ادا یہ بھی ہے کہ شعر پڑھنے سے پہلے تقریر کرتے ہیں، خصوصاً جب وقت کم ہو اور مشاعرے کا ہال خالی کرنے کے وقت سر پر آ پہنچا ہو اور ناظم مشاعرہ التجائیں کر رہا ہو کہ بس کوئی شاعر تین سے زیادہ شعر نہ پڑھے۔ ہمارا یہ شاعر پہلے بڑے اطمینان سے ایک تقریر کرتا ہے، پھر سو دفعہ کی سنی ہوئی غزل پڑھنے لگتا ہے۔

مگر جو تقریر یاد رہے گی وہ مختصر تھی مگر طویل تقریروں پر بھاری تھی۔ شاعر نے مائیکروفون پر آ کر کہا۔ ''خواتین و حضرات۔ اب تک میرا تخلص ناشاد تھا۔ اب میری شادی ہو گئی ہے لہٰذا آج سے میرا تخلص شاد ہو گیا ہے۔''

مجمع میں سے کسی نے صدا لگائی 'ارے میاں تھوڑے دنوں کے لئے تخلص کیوں بدلتے ہو؟'

ہمارا خیال تھا کہ شاعر برا مان جائے گا، مگر توبہ کیجئے۔

ایک مشاعرے میں ایک صاحب کا نام پکارا گیا تھا، یہ نام بالکل اجنبی تھا اور پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ وہ صاحب اسٹیج پر آئے اور اعلان کیا کہ خواتین و حضرات، آج سے میں شاعر ہو گیا ہوں۔ کسی نے ان کی طرف سے آواز لگائی کہ حیف، میں ہوا شاعر تو وہ شاعر مسلماں ہو گیا۔

یوں یہ مرض تو عام تھا۔ اچھے بھلے لوگ ایک دن اچانک شاعر ہو گئے۔ چلئے یہاں تک

بھی غنیمت تھا، ستم یہ ہوا کہ اندر سے وہ سارے کے سارے مزاحیہ شاعر نکلے۔

ایک مشاعرہ جو مجھے بہت یاد رہے گا اس کا ایک شاعر میں بھی تھا۔

میک اپ والے نے میرے گالوں پر موٹے موٹے بالوں والی کچھ سفید کچھ کالی ڈاڑھی گوند سے چپکا کر اور ماتھے پر موٹی سی پنسل سے شکنیں کھینچ کر مجھے ذرا دیر میں حکیم آغا جان عیش بنا دیا تھا۔

یہ مشاعرہ مرزا فرحت اللہ بیگ کی کتاب سے نکلا اور جمشید روڈ کراچی کے بہادر یار جنگ اسکول کے اسٹیج تک جا پہنچا۔ اسکول کی زندگی کے پانچ سال مکمل ہونے کا جشن تھا۔ اس موقع پر جو بہت کچھ ہوا اس میں دلّی کی آخری شمع کی تمثیل بھی شامل تھی۔ لڑکوں سے غزلیں پڑھوا کر دیکھا گیا اور بقول شخصے جن کی خواندگی اچھی تھی انہیں اداکاری کا فرض سونپ دیا گیا۔

بہت اہتمام تھا۔ بڑا اسٹیج بنایا گیا تھا جس پر روشنیوں کا انتظام تھا۔ میک اپ مین کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ ایک اعلیٰ درجے کا فوٹو گرافر بلایا گیا تھا اور پس پردہ کمنٹری کے لئے ریڈیو پاکستان کے نامور براڈ کاسٹر بدر رضواں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ اُن دنوں ریڈیو دکن کے کرارے لب و لہجے اور کھرج دار آواز والے کئی براڈ کاسٹر کراچی آ چکے تھے اور ریڈیو پاکستان میں اہل دکن کا اچھا خاصا عمل دخل تھا۔ بدر رضواں کا لب و لہجہ نہایت ستھرا تھا۔ وہ اسٹیج کے پیچھے کھڑے ہو کر ایک ایک شاعر کا تعارف کراتے تھے اور بہادر شاہ ظفر، غالب، ذوق اور مومن سے لے کر مجھ غریب حکیم آغا جان عیش تک کم و بیش ڈیڑھ درجن چھوٹے بڑے شاعر اپنی چھوٹی بڑی ڈاڑھیاں سنبھالے اسٹیج پر نمودار ہوتے تھے اور پہلے سے طے شدہ ٹھکانے پر بیٹھ جاتے تھے۔ شکر ہے سارے شاعر اندر سے نوجوان اور توانا تھے اور نہ کسی کے گھٹنوں میں درد تھا، نہ کسی کے جوڑ دکھتے تھے۔ چنانچہ ہم سارے شاعر دو دو گھنٹے اسٹیج پر بیٹھے رہتے تھے اور مشاعرہ ختم ہونے پر منہ سے کوئی آہ نکالے بغیر اور کسی کا سہارا لئے یا کوئی چیز تھامے بغیر اٹھ کھڑے ہوتے تھے اور جب ہمارے اصل ناموں کا اعلان ہوتا تھا تو جھک جھک کر حاضرین کی داد وصول کرتے اور میں محسوس کرتا کہ وہ فوٹو گرافر قریب آ کر میری تصویر اتارتا۔

حاضرین میں ایک بار حفیظ جالندھری مرحوم بھی شامل تھے۔ ہم لوگوں کی اداکاری تو خیر جیسی تھی ہمیں جانتے ہیں لیکن فرحت اللہ بیگ کی تحریر یقیناً دل و دماغ پر اثر کرتی تھی چنانچہ حفیظ جالندھری پر بھی اثر ہوا، آخر کو ابو الاثر تھے۔ مشاعرے کے خاتمے پر انہوں نے اسٹیج پر آ کر سارے لڑکوں کو نہ صرف داد دی بلکہ اپنے شاہنامہ اسلام کا ایک ایک نسخہ دینے کا وعدہ بھی کیا۔ غضب یہ ہوا کہ وعدے کے آخر میں انہوں نے انشاء اللہ کہہ دیا۔

دلّی کی آخری شمع میں خدا جانے کیا خوبی تھی کہ ہر شام اسکول کا دالان حاضرین سے بھر جاتا تھا۔ ہم اداکار روشنی میں بیٹھے ہوتے تھے اور حاضرین تاریکی میں۔ اس لئے وہ ہمیں ذرا کم ہی نظر آتے تھے۔ یوں بھی ہم نے ایک بار کے سوا کبھی انہیں دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔

اُس ایک بار کا قصہ یہ ہے کہ مشاعرے کی آخری شام صرف خواتین کے لئے مخصوص تھی۔ بس اُس مشاعرے کی بود و باش نہ پوچھو پچھم کے ساکنو۔

منتظمین نے پہلا کام تو یہ کیا کہ اچھا خاصا صرفہ اٹھا کر اسٹیج کے آگے لمبی چوڑی جالی تان دی۔ مقصد یہ تھا کہ سب ہمیں دیکھیں، اور ہم کسی کو نہ دیکھ پائیں۔

بس اُس رات ہجر کے صدمے اور وصال کی حسرت لئے ہوئے جتنی بھی غزلیں پڑھی گئیں، ان میں وہ تاثیر تھی کہ خدا کی پناہ۔ دنیا کے کسی اسٹیج سے اتنی سرد آہیں کب کھینچی گئی ہوں گی۔

خواتین کی خبر نہیں، ہم نوجوان اداکار اپنی اداکاری کے بہترین جوہر دکھاتے دکھاتے ہلکان ہو گئے۔ غضب یہ ہوا کہ مشاعرہ ختم ہوتے ہی عورتیں اٹھیں اور تالیاں بجائے بغیر ادھر آپس میں دنیا زمانے کی باتیں کرتی ہوئی عمارت سے نکل گئیں۔ کہیں کسی کی زبان پر حکیم آغا جان عیش کا نام ایک بار جو آیا ہو۔

بس ذرا سی تشفی اس وقت ہوئی جب مشاعرے کے خاتمے پر وہ فوٹو گرافر مجھے ڈھونڈتا ہوا میرے پاس آیا۔ بڑی گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ ’’حکیم آغا جان عیش میرے پردادا تھے‘‘۔

ہم دونوں بغل گیر ہو گئے اور دیر تک رہے۔

میں آج تک طے نہیں کر پایا ہوں کہ میں نے اُسے سینے سے لگا رکھا تھا یا اُس نے مجھے۔

اجتماع، اردو کے نام پر

کراچی بھی بڑی خوبیوں کا شہر ہے۔

تین دن کی عالمی اردو کانفرنس کا آخری دن تھا اور چالیس کے قریب مندوبین اور سوسوا سو حاضرین کچھ بہت سنجیدہ تجویزوں پر اتنی ہی سنجیدگی سے غور کر رہے تھے۔ انہماک کا یہ عالم تھا کہ اجلاس کے خاتمے کا وقت آ کر گزر بھی گیا اور غور و خوص چلتا رہا۔ جب بیشتر معاملات طے پا گئے اور کسی نے گھڑی کی طرف نگاہ کی تو احساس ہوا کہ رات کے کھانے کا وقت ہو گیا ہے اور اتنے بہت سارے افراد کو بھوکا نہیں لوٹایا جا سکتا۔ اچانک کسی کے ذہن میں بجلی سی کوندی۔ صدر میں ایمپریس مارکیٹ کے قریب کوئی جگہ ہے جہاں اسٹوڈنٹس بریانی ملتی ہے۔ ہوتی تو ہے وہ مٹن بریانی مگر اسی نام سے مشہور ہے۔ جھٹ اسٹوڈنٹس بریانی والوں کو فون کیا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں سوزوکی وین پر لدی ہوئی گرم بریانی کی دیگیں آ گئیں، ذرا دیر میں میزیں لگ گئیں اور دنیا بھر سے آئے ہوئے اردو کے استادوں نے اُس شام طالب علموں کے نام کی بریانی مزے لے لے کر کھائی۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ مندوبین دوبارہ سر جوڑ کر بیٹھے اور باقی معاملات طے کر کے چھوڑے۔

اردو دنیا میں جس نئی چیز نے رواج پایا ہے اسے 'عالمی اردو کانفرنس' کا نام دیا جاتا ہے۔ میرے ہوش میں اس طرح کی چار کانفرنسیں ہو چکی ہیں۔ دو ماریشس میں تیسری کراچی میں اور چوتھی نیویارک میں۔ جن کانفرنسوں کا وعدہ ہے وہ لندن، حیدرآباد کن اور ٹورانٹو میں ہونی ہیں۔

اردو کے ان عالمی اجتماعات میں دور دور سے مندوب بلائے جاتے ہیں جو اپنے اپنے موضوعات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کے علاوہ مباحثے ہوتے ہیں اور نئے پرانے، ہر طرح کے سوال اٹھائے جاتے ہیں۔ آخر میں قراردادیں منظور ہوتی ہیں اور فیصلے کئے جاتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد قراردادیں فائلوں میں دب جاتی ہیں اور فیصلے وقت کی گرد میں، یہاں تک کہ اگلی کانفرنس شروع ہو جاتی ہے، پھر سے قراردادیں سجائی جاتی ہیں اور فیصلے آراستہ کئے جاتے ہیں، اور پھر سے انہیں بھلانے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ کہیں کوئی ان پر عمل درآمد کے لئے مچل نہ جائے۔

میں اس معاملے میں کراچی کی عالمی اردو کانفرنس کو نہیں بھول سکتا، یہ اوائل ستمبر ۱۹۹۳ء کی بات ہے۔ اس کا اہتمام انکم ٹیکس کے ایک افسر اعلیٰ جناب شوکت زیدی نے کیا تھا۔ کمال کا اجتماع تھا جس میں مندوبین جنوبی کوریا، آسٹریلیا، پولینڈ، وسطی ایشیا تک سے بلائے گئے تھے۔ جنوبی کوریا کے بارے میں کسی کو گمان بھی نہ تھا کہ وہاں اردو کی تعلیم ہوتی ہے۔ آسٹریلیا سے ایک سفید فام خاتون آئی تھیں جو وہاں اردو کی تدریس شروع کرنے کی مہم چلا رہی تھیں۔ پولینڈ سے ایک نوعمر خاتون آئی تھیں جنہیں اردو اور ہندی، دونوں سے شغف تھا۔ انہوں نے اپنا نام آشا رکھ لیا تھا اور بتایا تھا کہ پولینڈ میں فوج اور پولیس کو اردو تو نہیں البتہ اُردا کہا جاتا ہے اور یہ بھی صدیوں پہلے ترکوں کا چھوڑا ہوا تر کہ تھا۔

چین سے کم سے کم دس اردو داں مندوبوں کے وفد کا آنا باعث حیرت نہ تھا۔ پاکستان کے معاملے میں اہل چین یوں بھی کافی فیاض ہیں۔ انہوں ہی نے کہا تھا کہ اتفاق سے اردو میں چینی کا کوئی لفظ نہیں ہے۔ اس پر کسی کے اس تبصرے نے بڑا لطف دیا تھا کہ پھر اردو میں یہ مٹھاس

کہاں سے آئی۔

دہلی سے برادرم قمر رئیس آئے تھے جنہوں نے اجلاس میں سرگرمی سے حصّہ لیا اور میری اس تجویز کی پرزور تائید کی کہ ایک عالمی انجمن ترقی اردو قائم کی جائے جو برصغیر سے باہر جہاں کہیں بھی لوگ اردو کی ترویج کے لئے کام کر رہے ہیں ان کا ہاتھ بٹائے۔

اس تجویز پر پوری کانفرنس میں ایسا اتفاق ہوا کہ رات بھر کام کر کے اس کا دستور تک تیار کر لیا گیا اور تمام بنیادی معاملات طے کر کے مندوبین اپنے اپنے ملکوں کو سدھارے۔

یوں لگتا تھا کہ اس بار ایک عالمی اجتماع کے کسی فیصلے پر عمل ہو ہی جائے گا۔ کانفرنس کے میزبان، جن کے بارے میں عرض کر چکا ہوں کہ انکم ٹیکس کے افسر اعلیٰ تھے، اس بڑے کام کا بیڑا اٹھانے چلے۔

مگر اس کے بعد کی کہانی دردناک ہے۔ سنا ہے کہ ان افسر اعلیٰ کو ان کے حکام بالا نے طلب کیا۔ ان کی سرزنش کی اور کہتے ہیں کہ ان سے کہا گیا کہ کیوں صاحب، آپ کو سارا عشق اردو ہی سے کیوں ہے، ملک کی دوسری زبانوں سے کیوں نہیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ اس کے بعد افسر مذکور کے ساتھ کچھ سلوک بھی کیا گیا۔

پوری تجویز خس و خاشاک کی طرح اس ایک جھونکے کی نذر ہو گئی۔

تازہ خبر یہ ہے کہ پاکستان کی قومی اسمبلی میں مباحثے کے دوران کسی نے اردو کو ملک کی قومی زبان کہہ دیا۔ اس پر بعض ارکان اسمبلی اتنے برہم ہوئے کہ بس چلتا تو یہ بات کہنے والے کی زبان گدّی سے کھینچ لیتے۔ بڑی مشکل سے معاملہ اس اقرار پر ٹھنڈا ہوا کہ اردو محض رابطے کی زبان ہے،، علاقے کی زبانیں ہی اصل میں قومی زبانیں ہیں۔ یہ بات کہنے کا اس جگہ محل نہ تھا مگر پھر سوچتا ہوں کہ تھا۔ اس پر گفتگو کسی دوسری جگہ ہوگی۔

اردو سے تعلق رکھنے والے بے شمار لوگ جانتے بھی نہ ہوں گے کہ برصغیر کے ساحلوں سے ہزاروں میل دور جنوبی افریقہ کے ساحل کے قریب چھوٹے سے جزیرے ماریشس میں لوگ اردو بولتے ہیں، سمجھتے ہیں، لکھتے ہیں، پڑھتے ہیں، اردو ٹیلی وژن دیکھتے ہیں اور اردو میں شعر بھی

کہتے ہیں۔

اگر چہ سیاسی اعتبار سے ماریشس میں ہندوستان کا اور اس مناسبت سے ہندی کا پلڑا جھکتا ہوا ہے مگر چونکہ جمہوریت مستحکم ہے اور ووٹ لینے کی خاطر ووٹر کی بات سننے کے مرحلے بار بار آتے ہیں اس لئے اردو بولنے والوں کو نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ اردو کے نام پر سرکار سرپرستی کے کام بھی کرتی ہے اور اس زبان کے فروغ کے لئے سرکاری خزانے کا منہ کھلا رکھا جاتا ہے۔

جہاں تک مجھے علم ہے، اردو کی پہلی عالمی کانفرنس ماریشس ہی میں ہوئی تھی۔ دوسری کانفرنس کی بات زیادہ پرانی نہیں۔ اگست ۲۰۰۳ء کے اس اجتماع میں شرکت کا شرف مجھے بھی ملا۔ ہندوستان سے بڑا وفد آیا۔ پاکستان سے آنے والا وفد بھی چھوٹا نہ تھا۔ اس کے علاوہ برطانیہ، جرمنی، روس، وسطی ایشیا اور امریکہ سے بھی لوگ بلائے گئے تھے۔

پہلے روز افتتاحی اجلاس تھا۔ شان دار تقریب تھی جس میں ملک کے صدر سے لے کر اعلیٰ حکام تک بھی آئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عمائدین شہر بھی آئے، تقریریں سننے کم، حکام سے ہاتھ ملانے زیادہ۔

اگلے روز سے اجلاس شروع ہوئے۔ ان میں اعلیٰ حکام نہیں آئے اس لئے عمائدین شہر نے بھی زحمت نہیں کی۔ کچھ اردو سے دل چسپی رکھنے والے لوگ آئے اور کچھ مقامی مدرسوں کے اردو اساتذہ جنہیں غالباً شرکت کی ہدایت تھی۔

تقریریں کرنے والے مندوبین میں بعض تو ایسے تھے کہ بارہا ماریشس آ چکے تھے، یہاں کے باشندوں کے مزاج سے واقف تھے۔ کچھ ایسے تھے کہ جن کا ادھر سے گزر نہیں ہوا تھا۔ جو واقف تھے انہوں نے ماریشس والوں کے مزاج کے مطابق تقریریں کیں۔ جو ناواقف تھے انہوں نے اردو ادب میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت اور اسی قبیل کے ایسے ایسے راگ الاپے کہ ہماری زبان پر کبھی الامان آتا تھا اور کبھی الحفیظ۔

ایک پاکستانی مندوب کی تقریر میں کہیں سے 'شہید بھٹو' کا ذکر آ گیا۔ ایک ہندوستانی مندوب نے پاکستان کو دشمن کہا۔ پچھلی صفوں والے بے چارے چپ سادھے بیٹھے رہے۔ اگلی

صفوں میں بیٹھے مندوبین نے صدائے احتجاج بلند کی چنانچہ تقریروں کے متن درست کرنے پڑے۔ متن نہ ہوا، قبلہ ہو گیا۔

ماریشس والے اپنے کام بڑے سلیقے سے کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے رپورٹر بٹھائے تھے جنہوں نے پوری کارروائی قلم بند کی اور آخری روز اس کا نچوڑ پیش کیا۔ آخر میں وہی قرار دادوں اور فیصلوں کا مرحلہ آیا۔ قرار دادیں لاجواب تھیں، فیصلے بے مثال۔ اس کے بعد کیا ہوا، خدا ہی جانے۔

ہاں ایک شام اردو ڈراما کھیلا گیا۔ ایک شام دلّی سے آئے ہوئے قوال نے قتال کا کام کیا۔ آخری شام مشاعرہ ہوا۔ ان تقریبات میں مجمع خوب تھا اور رونق کی کمی نہ تھی۔ مشاعرے میں پاکستان اور ہندوستان کے چوٹی کے شاعر شریک تھے۔ مگر اس رات مجھے میر انیس یاد آ گئے کہ حیدر آباد مرثیہ پڑھنے گئے۔ کہاں تو اہل لکھنؤ ایک ایک مصرعے پر آسمان سر پر اٹھا لیا کرتے تھے، یہاں اہل دکن نے یہ کیا کہ جوں ہی میر صاحب نے مرثیہ پڑھنا شروع کیا، حاضرین سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ میر انیس نے مشکل سے کچھ بند پڑھے اور پھر یہ کہتے ہوئے منبر سے اتر گئے کہ میں جمادات اور نباتات کے سامنے مرثیہ نہیں پڑھ سکتا۔ اگلے روز حاضرین مجلس کے درمیان جگہ جگہ لکھنؤ والے بٹھائے گئے تاکہ وہ مصرعوں کو اٹھائیں تو دیکھا دیکھی اہل دکن بھی یہی کریں۔

اس رات ماریشس کے مشاعرے میں کشور ناہید سمیت تمام پردیسیوں نے شاعروں کو داد دے کر چاہا کہ مقامی حاضرین بھی لے میں لے ملائیں۔ مگر وہ سر جھکائے بیٹھے رہے۔ وہ بھی شاید داد دینے کو بے ادبی خیال کرتے ہیں۔

آخری روز ہندوستانی مندوبوں نے اپنی بیٹیوں کے جہیز میں دینے کے لئے فرانسیسی برتن اور چینی مصنوعات خریدیں، تاشقند کے مندوبوں نے وسطی ایشیا کی نان کے ٹکڑے چکھائے، ماریشس کی نوجوان لڑکیوں نے اُس رقص کا مظاہرہ کیا جسے سیگا کہتے ہیں۔ ڈیوڈ میتھیوز رقص میں شریک ہوئے، ساتھ میں ان کی بیگم بھی تھیں۔ قمر علی عباسی اُس طرف پیٹھ کئے بیٹھے رہے کیونکہ ساتھ میں ان کی بیگم بھی تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اب ان کے سفرنامے میں اسی رقص کی رونگٹے

کھڑے کردینے والی تفصیلات شامل ہوں گی کیونکہ وہ آسمان سے لاتے ہیں ان زمینوں کو۔

آخر میں الوداعی ضیافت ہوئی، رابطے قائم رکھنے کے وعدے ہوئے، پتوں اور ٹیلی فون نمبروں کے تبادلے ہوئے اور ہم سب کے طیارے خط استوا پار کر کے دوبارہ گرم موسم میں لوٹ آئے۔

اب جس کانفرنس کا احوال ہے وہ نصف کرہ شمالی میں ہوئی۔

یہ بات ماہ جون ۲۰۰۴ء کی ہے اور یہ قصہ امریکہ کی ریاست نیو جرسی کا ہے جو نیویارک کی پڑوسن ہے۔ اس کانفرنس کا اہتمام امریکہ اور کینیڈا سے نکلنے والے ہفت روزہ اردو ٹائمز نے کیا تھا۔ یہ اخبار ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوتا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس سے ملتے جلتے اور بھی کئی اخبار بڑی تعداد میں شائع ہوتے ہیں۔ لیکن ان سب میں ایک بات مشترک ہے۔ سارے کے سارے مفت تقسیم ہوتے ہیں، امریکہ میں اردو اخبار قیمتاً فروخت کرنے کا کوئی تصور نہیں۔ تمام ہندوستانی اور پاکستانی ٹھکانوں پر یہ اخبار سینکڑوں کی تعداد میں رکھ دیئے جاتے ہیں۔ وہاں آتے جاتے گاہک انہیں اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔

یہ اخبار بڑے بڑے اشتہاروں سے بھرے ہوتے ہیں اور یہی اشتہار ان اخباروں کو زندگی عطا کرتے ہیں۔ اردو ٹائمز میں بڑا عملہ ہے۔ اس کے امریکہ اور کینیڈا میں کئی دفتر ہیں، ایک دفتر پاکستان میں ہے۔ دونوں جگہ مل کر اخبار کے صفحے تیار ہوتے ہیں اور انٹرنیٹ کے ذریعے پلک جھپکتے میں مرتب ہو کر چھاپے خانے میں پہنچ جاتے ہیں اور ذرا سی دیر میں روٹری مشین پر چھپ کر نکل آتے ہیں۔

اس میں کیا شک ہے کہ ان کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو روزگار ملا ہوا ہے اور کتنے ہی کاروبار ان کے دم سے چل رہے ہیں۔ اخبار چھاپ کر مفت تقسیم کرنا یہاں مغرب میں کوئی معیوب بات نہیں۔ ایسے اخبار یہاں فری شیٹ کہلاتے ہیں اور انہیں قیمتاً بکنے والے جریدوں سے کم تر نہیں سمجھا جاتا۔

امریکہ اور کینیڈا سے بیک وقت شائع ہونے والا اردو ٹائمز کامیاب اخبار ہے اور اس کو اتنے ہی وسائل دستیاب ہوں گے کہ اس ادارے نے نیویارک کے قریب ایک چھوٹے سے شہر ایڈیسن میں عالمی اردو کانفرنس کا اہتمام کیا۔

مجھے یاد ہے کہ جس شام میں لندن سے نیویارک پہنچا، مجھے ہوائی اڈے پر لینے کوئی نہیں آیا تھا۔ ادھر اُدھر فون کئے تو بڑی مشکل سے یہ طے پایا کہ میں ٹیکسی لے کر ایڈیسن چلا جاؤں۔ وہاں پہنچا تو فارغ بخاری مرحوم کا بیٹا دیوانوں کی طرح دوڑ دھوپ کر رہا تھا کیونکہ مندوبین پہنچنے شروع ہو گئے تھے اور ان کے استقبال کے لئے کوئی اور موجود نہ تھا۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے اور اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ نو وارد مندوبین کے لئے کھانے کا انتظام کرنے کا کسی کو خیال بھی نہ آیا تھا۔ جب رات کی تاریکی نے بڑھنا اور بھوک نے چمکنا شروع کیا تو اندھیرے اجالے کی اس آمیزش میں انکشاف ہوا کہ اس شہر میں نان، قورمے، کباب اور بریانی کا ایسا بندوبست ہے کہ کراچی کی اسٹوڈنٹس بریانی بھی شرما جائے اس کے آگے۔ چنانچہ کاروں میں بھر کر مندوبین شہر ایڈیسن کے ایک بازار میں پہنچے جہاں آدھی رات کو اور تو سب کچھ بند تھا البتہ پاکستانی طعام خانے برقی قمقموں سے ویسے ہی چمک رہے تھے جیسے مندوبین کی بھوک۔

یہ تمام روداد لکھنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ عالمی اردو کانفرنس منعقد کرنے کے لئے مغرب میں اس سے بہتر مقام اور کہاں ہو سکتا تھا۔

اردو کے ساتھ ایک بڑا مسئلہ مشاعرے کا ہے۔ مشاعرہ نہ ہو تو اردو کے نام پر دکھ جھیلنے سے کسی کو دلچسپی نہیں لہٰذا دور اور قریب کے علاقوں سے مندوبین کو بلاتے وقت یہ خیال بطور خاص رکھا جاتا ہے کہ وہ دانش ور ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی ہوں۔

کانفرنس تین دن چلی۔ جمعے کو رسمی کارروائی ہوئی۔ ہفتے کو جب عام تعطیل ہوتی ہے، تو سنجیدہ موضوعات پر خوب خوب گفتگو ہوئی۔ اتوار کو سارا ہی کاروبار بند ہوتا ہے اور اگلی صبح لوگوں کو کام پر جانا ہوتا ہے لیکن اس رات چونکہ مشاعرہ تھا اور اس سے پہلے کھانے کی دعوت عام، شام ہوتے ہوتے کانفرنس کو چار چاند لگ گئے۔ پھر جو مشاعرہ ہوا، جاگ کر سننے والے بتاتے ہیں کہ

صبح تین بجے تک چلا۔ صدارتی کلام سنانے اور صدارتی خطبہ دینے کا فرض جناب شان الحق حقی کے حصے میں آیا جو چاند کی تاریخوں کے حساب سے نوے برس کے ہوا چاہتے ہیں اور دیکھنے میں بالکل ضعیفی کے دنوں کے ٹالسٹائی جیسے نظر آتے ہیں۔

ان کی یادداشت اور توانائی کے قصے بہت مشہور ہیں چنانچہ اس رات تین بجے انہوں نے نہ صرف لمبی صدارتی تقریر کی بلکہ اپنا کلام بھی اس شان سے سنایا کہ ہاتھ میں نہ کوئی بیاض تھی نہ کوئی شعری مجموعہ۔ مجمع داد دیتے دیتے گھروں کو چلا گیا اور میں مجمع کو داد دیتے دیتے اپنے ہوٹل کے کمرے میں جا کر سو گیا۔

یہ ہے اردو شاعری اور مشاعروں کا کمال۔

تین دن کی کانفرنس کو تقریباً آٹھ موضوعات میں بانٹ دیا گیا تھا۔ ان میں اقبالیات سے لے کر افسانے تک بوجھل اور کم بوجھل موضوعات میں اچھا خاصا تنوع تھا۔ ابتدا تنقید نگاری سے ہوئی جس کی صدارت گوپی چند نارنگ کو سونپی گئی تو انہوں نے کہا کہ آپ نے اچھا کیا کہ پیچیدہ اور دشوار اور اک ذرا سا اختلافی موضوع شروع ہی میں نمٹا دیا۔

اس مباحثے کا دل چسپ پہلو یہ تھا کہ کیا تنقید نگار غیر جانب دار ہو سکتا ہے؟

جواب ملا۔ نہیں۔

دوسرا سوال، جسے امتحانی پرچے کا سوال قرار دیا گیا یہ تھا کہ جب سے اردو ادب میں تنقید شروع ہوئی ہے، تنقید نے کبھی ادب کے رخ کو بدلا ہے؟

جواب ملا۔ ہاں۔

اور پھر بات نیچرل شاعری سے چل کر علامتی اور تجریدی کہانی تک پہنچی۔ جس موضوع کو بوجھل اور خشک سمجھا گیا تھا، اسی پر، میری رائے میں، سب سے پر لطف گفتگو ہوئی۔

دوسرا موضوع اردو ادب میں اقبالیات کا تھا جس کی صدارت اقبال اکیڈمی کے ڈاکٹر سہیل عمر کے ذمے تھی۔ اقبال کے موضوع پر زیادہ مباحثے کی گنجائش نہیں تھی۔ جتنی باتیں کہی گئیں، حاضرین نے سب سے اتفاق کیا۔ ان مباحثوں میں حاضرین کو برابر سے شریک کیا گیا تھا

اس لئے مباحثے اعلا دانش وروں والی سطح پر ٹکے نہیں رہے بلکہ ان میں ایک عام رائے اور عام نظریے کی پذیرائی ہوئی جس سے ہر سطح کے درمیان رابطے کی صورت نکلی اور گفتگو میں جان پڑ گئی۔

اگلا موضوع اردو غزل کا تھا اور صدارت شان الحق حقی کے حصے میں آئی تھی۔ اس مباحثے میں بھی اختلاف کی گنجائش کم تھی اور سارے شرکا ایک دوسرے کے ہم خیال تھے۔ صرف ایک طرف سے آواز اٹھی کہ یہ کیا بات ہے کہ گلی گلی کوچے کوچے غزل کہی جا رہی ہے اور نثر اور تنقید پیچھے رہی جا رہی ہے۔ حقی صاحب نے کہا کہ اس میں کچھ تن آسانی بھی ہے۔ شعر کہنا آسان ہے۔ حیرت ہے اس پر شاعر حضرات چپ رہے۔ اُس وقت ساقی فاروقی بہت یاد آئے مگر حقی صاحب کے ادب کے خیال سے شاید وہ بھی اپنے معمولات اُٹھا رکھتے۔

پھر ادب میں نعت گوئی کی بات چھڑی۔ اچانک سب محتاط ہو گئے۔ با محمدؐ ہوشیار۔ لیکن معاملے کے اس پہلو پر بحث ہوئی کہ احترام کے اظہار پر اتنا زور دیا جانے لگا ہے کہ نعت میں شاعر اپنی روایتی آزادی نہیں برت سکتا۔ اس کے برعکس حمد میں ایسی احتیاط نہیں چنانچہ اس میں شعری لطافت کا خوب خوب اظہار ہوتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ نعت گوئی پر زور ہے اور حمد کہنے کا کچھ زیادہ چلن نہیں۔ یہ سوال بھی اٹھا کہ نعت گوئی سے شغف رکھنے والا معاشرہ مبالغے اور غلو کی زد میں تو نہیں آ رہا ہے؟

کانفرنس کے اگلے روز مرثیے کا موضوع تھا اور اس مذاکرے کے صدر ڈیوڈ میتھیوز تھے جنہوں نے انیس کے ایک بڑے مرثیے کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس مذاکرے میں جس بات پر زور دیا گیا وہ یہ تھی کہ شبلی سے لے کر آج تک مرثیے پر نگاہ رکھنے والے میر انیس کی طرف داری میں اتنا آگے بڑھ گئے کہ مرزا دبیر کو پیچھے چھوڑ دیا گیا اور ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ اردو زبان کے تقدس اور تحفظ میں مرثیے کے کردار کو سراہا گیا اور دبیر کا ان کا جائز مقام دلانے کا عزم کیا گیا۔

اس کے بعد اردو میں افسانے کی بات چھڑی اور امجد اسلام امجد نے صورت حال کا

جائزہ لیا۔ اس مذاکرے میں اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا گیا کہ کہانی میں کہانی پن لوٹ آیا ہے اور بیچ میں تجربہ کا جو دور آیا تھا، یا یوں کہیئے کہ جو دورہ پڑا تھا، مقام شکر ہے کہ اس کالی گھٹا کو وقت کی ہوا اڑا لے گئی۔ بحث میں ایک بار بھی یہ نہیں کہا گیا کہ اردو افسانہ مر گیا ہے مگر ایک سرکردہ افسانہ نگار خاتون کو یہی سنائی دیا اور وہ برہم بھی ہوئیں۔

اردو صحافت پر بھی گفتگو ہوئی۔ روزنامہ سیاست حیدرآباد کن کے مدیر اعلا زاہد علی خان نے موضوع کی مناسبت سے مثالیں دے کر بتایا کہ ایک اخبار ایک طبقہ فکر کی رائے کو کس طرح بدل سکتا ہے۔ اس کے بعد والے مقرر نے اخبار سیاست کی تعریف میں ذرا زیادہ ہی زور صرف کر دیا تو اگلے مقرر نے انہیں مبارک باد دی کہ لیجئے، آپ نے سیاست میں اپنی جگہ بنا لی ہے۔ دونوں مقرر کالم نگار تھے لہٰذا ایک نے تو نہیں البتہ دوسرے نے کہا کہ قوموں کی رائے خبروں سے نہیں، کالموں سے بدلا کرتی ہے۔

کاش کسی نے ہم سے پوچھ لیا ہوتا۔

آخر میں جو عنوان موضوع بحث بنا وہ تھا 'اردو کی نئی بستیاں'۔ اس میں ایک عملی بحث چھڑی جس میں سارے کے سارے سامعین کو شامل کر لیا گیا کیونکہ وہ سب اردو کی ایک نئی بستی کے باسی تھے اور زیر بحث مسئلہ ان کے گھر کا مسئلہ تھا۔ گفتگو یہ تو کم ہوئی کہ اردو کی نئی بستیوں میں زبان کے مسئلے کیا ہیں، بلکہ بات یہ زیادہ ہوئی کہ جو مسئلے ہیں وہ تو سامنے کے ہیں، ان کا حل کیا ہونا چاہئے۔ حاضرین نے اپنا اپنا حل تجویز کیا اور خصوصاً خواتین کی طرف سے یہ رائے آئی کہ اس سلسلے میں حکومتوں سے توقع رکھنا غلط ہے اور یہ ذمے داری گھر کے بزرگوں پر، خصوصاً ماں پر آتی ہے کہ وہ بچوں کی اردو زبان سے شناسائی برقرار رکھے۔

کسی نے کہا کہ مائیں اگر بچوں کو اردو نہیں پڑھاتیں تو انہیں سونے سے پہلے کہانیاں ہی اردو میں سنا دیا کریں۔

اردو کی اس عالمی کانفرنس کے منتظمین کو شاید خود بھی یہ احساس نہ ہوگا کہ یہ اجتماع اردو زبان کے معاملات پر نہیں بلکہ اس زبان سے تعلق رکھنے والے معاشرے کے جذبات، احساسات

اور رویوں پر غور کرے گا۔ تین دن کی مسلسل گفتگو اور اس سے بھی بڑھ کر تبادلہ خیال نے اگرچہ بہت سے سوالوں کے جواب فراہم کر دیئے لیکن ذہن میں بہت سے نئے سوال پیدا بھی کر دیئے۔ اس کانفرنس سے ایک طرح کی تسکین ملی لیکن ایک طرح کی پیاس بھی بڑھ گئی اور اب یوں معلوم ہوتا ہے کہ کانفرنس کے شرکا عرصے تک بہت سی باتوں پر غور کرتے رہیں گے۔ آپس میں ملیں گے تو بہت کچھ سوچیں گے اور جب کبھی اس قسم کا دوسرا اجتماع ہوگا تو اس طرح کے سوال اٹھائے جائیں گے جو اس پہلی کانفرنس میں زیرِ غور آنے سے رہ گئے۔

یہی اس طرح کے اجتماعات کی سب سے بڑی افادیت ہے۔

نئی بستیاں، نئے مسائل

یہ قصہ نیو یارک کا ہے۔ اردو کی عالمی کانفرنس جاری تھی اور دنیا کے مختلف ملکوں میں زبان کے فروغ کے سوال پر سنجیدہ بحث ہو رہی تھی۔ صدارت کا اعزاز میرے حصے میں آیا تھا۔

موضوع یہ تھا کہ مغربی ملکوں میں آباد اردو داں طبقے کی نئی نسل اپنی مادری زبان سے کٹتی جا رہی ہے۔ غور اس بات پر ہو رہا تھا کہ نئی نسل کو زبان کا ورثہ کیونکر سونپا جائے۔

بحث میں خواتین بھی شریک ہو گئیں اور اس سوال پر اتفاق رائے ہوا کہ نئی نسل کو اردو سکھانے کے لئے حکومت یا تعلیمی اداروں سے امید رکھنا فضول ہے۔ یہ کام خود گھر والوں کو، بزرگوں کو اور خصوصاً خواتین کو اپنے ذمے لینا ہوگا۔

سیر حاصل گفتگو کے بعد نشست برخاست ہو گئی تو ایک بزرگ میرے پاس آئے۔ ان کا تعلق امریکہ کی کسی دور افتادہ ریاست سے تھا۔ بولے کہ آج کی بحث بڑی مفید رہی لیکن براہ کرم میری مثال کو پیش نظر رکھا جائے۔ میں نے کہا۔ "فرمایئے۔"

بولے۔ "میرا کم سن پوتا مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ اکثر میرے ساتھ کھیلتا ہے اور

اپنی کتابیں مجھے دکھاتا ہے۔ ہم دونوں دادا اور پوتے ہی نہیں، بہت اچھے دوست بھی ہیں۔ لیکن جب بھی میں اُسے اردو سکھانے کی کوشش کرتا ہوں تو پتہ ہے وہ کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

Dada Abba, I hate you (دادا ابّا۔ مجھے آپ سے نفرت ہے)

یہ محض ایک گھر کی مثال نہیں، گھر گھر کا قصہ ہے۔ ہم اردو میں سوال کرتے ہیں، ہمارے بچے انگریزی یا اپنے ملک کی زبان میں جواب دیتے ہیں۔ ہم شکر ادا کرتے ہیں کہ وہ ہمارا سوال تو سمجھ لیتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد اس کے بھی لالے پڑ سکتے ہیں۔

فاصلہ صرف زبان ہی کا نہیں، زبان کی منطق کا بھی ہے۔

اردو میں کہیں گے: آج صبح بغداد میں ایک بڑا دھماکہ ہوا جس میں دس آدمی مر گئے۔

انگریزی میں کہیں گے: دس آدمی مر گئے، ایک بڑے دھماکے میں، بغداد میں، آج صبح۔

ہم لوگ فطری طور پر اردو میں سوچتے ہیں، پھر انگریزی میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہمارا استدلال کا طریقہ الجھ کر رہ گیا ہے۔

یہ ساری باتیں کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بیرونی دنیا میں آباد اردو داں طبقے کا ایک بڑا جذباتی مسئلہ نئی اور پرانی نسل کے درمیان رابطے کا بڑھتا ہوا فقدان ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ نئی نسل کو اپنی آبائی زبان سکھانا دشوار ہوتا جا رہا ہے۔

برطانیہ، امریکہ اور کینیڈا کا موازنہ کیا جائے تو برطانیہ کے بارے میں یہ انکشاف بہت دل چسپ ہے کہ یہاں دوسری غیر ملکی زبانوں کی طرح اردو کے امتحان بھی ہوتے ہیں جن میں بیٹھنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کی سالانہ تعداد سات ہزار سے کم نہیں ہوتی۔ یہ وہ نوجوان ہیں جن کے کانوں میں بچپن ہی سے اردو پڑتی رہتی ہے لہٰذا وہ آسانی سے کچھ بنیادی چیزیں سیکھ لیتے ہیں اور نہ صرف نمایاں نمبروں سے امتحان پاس کر لیتے ہیں بلکہ اکثر اے گریڈ بھی حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے مجموعی نتیجے میں ایک اعلیٰ گریڈ کا اضافہ ہو جاتا ہے جس کے بعد یونیورسٹی میں

داخلہ لینا آسان ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد ان کی سیکھی ہوئی اردو کا حشر کیا ہوتا ہے، ہمیں کبھی آزما کر دیکھنے کا موقع نہیں ملا لیکن لندن کی ایک مجلسِ مذاکرہ میں اردو کے ایک سینئر استاد اور ممتحن کے مقالے کے بعد ہم نے ان سے پوچھا کہ کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ نوجوان محض ایک اے گریڈ کی خاطر اردو کے امتحان میں بیٹھتے ہیں؟

جواب ملا۔ ''جی یہ کہنا غلط بھی نہ ہوگا''۔

ہم نے پوچھا کہ امتحان پاس کرنے والا ایک طالب علم اردو اخبار کی شہ سرخی پڑھ سکتا ہے؟

جواب آسان تھا۔ کہنے لگے۔ ''مشکل سے''۔

یہ تو ہوا برطانیہ کی صورت حال کا محض ایک پہلو۔ امریکہ میں ایسا کوئی امتحان نہیں ہے۔ اردو کے بغیر دنیا کے سارے کام چل جاتے ہیں اور چونکہ والدین عموماً پڑھے لکھے ہیں اور گاؤں دیہات سے نہیں آئے ہیں، انگریزی سوال کا جواب انگریزی میں دینے کے اہل ہیں، نوجوانوں کا اردو سے تعلق منقطع ہوا جاتا ہے۔ اور وہی برطانیہ والی صورت حال ہے کہ سمجھ لیتے ہیں، بول نہیں سکتے۔ صاف نظر آتا ہے کہ اگلی نسل تک یہ تکلف بھی اٹھ جائے گا۔

کینیڈا میں مختلف صورت نظر آئی۔ اکثر بچے اردو بول رہے تھے۔ اس کے اسباب بہت دل چسپ ہیں۔ ایک تو یہ کہ بے حد لمبا چوڑا ملک ہے۔ ایک کنبہ دوسرے سے ملنے جائے تو موٹر گاڑی دو دو تین تین گھنٹے چلتی ہے تب کہیں منزلِ مقصود آتی ہے۔ اس کے علاوہ جب سردی پڑتی ہے تو غضب کی پڑتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ سب نہیں تو اکثر کنبے اپنا زیادہ وقت اپنی ہی چار دیواری کے اندر گزارتے ہیں چنانچہ اہل خانہ کے درمیان گفتگو کا رابطہ برقرار رہتا ہے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ کینیڈا کے شہر ٹورنٹو کو مقامی طور پر 'شہرِ اردو' کہا جانے لگا ہے۔ اس علاقے میں اردو کا کافی چلن ہے۔ برصغیر سے مختلف فن کار کثرت سے آکر اپنی زبان میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اب تو وہ قبیلہ مسلسل آنے لگا ہے جسے عرفِ عام میں پاپ سنگر کہا جاتا ہے۔

نوجوان بڑی تعداد میں انہیں دیکھنے اور ان کے اردو گانے سننے جاتے ہیں۔

تیسرا دلچسپ سبب یہ ہے کہ برطانیہ اور امریکہ کے برعکس کینیڈا کے ٹیلی وژن پر اردو پروگرام مفت آتے ہیں اور رات دن آتے ہیں۔ کنبے چونکہ بیشتر وقت گھروں میں گزارتے ہیں، نئی نسل نے ان پروگراموں سے ایک طرح کی وابستگی قائم کرلی ہے اور زبان اب نسل در نسل نہیں بلکہ ٹیلی وژن در نسل چل رہی ہے۔

ہندوستانی فلموں کی مصنوعی بارش میں بھیگتے دو محبت کرنے والوں کے بدن سے چپکے ہوئے لباس کو جانے دیجئے تو جہاں تک مکالموں کا تعلق ہے، کبھی کبھی تو اتنی شگفتہ اردو سننے کو ملتی ہے کہ بولی ووڈ کے حق میں دل سے دعا نکلتی ہے۔ اسی طرح پاکستان کے ٹیلی وژن پرگراموں میں اکثر اوقات لباس اور مکالمے، دونوں ہی شگفتہ ہوتے ہیں جنہیں گھر کے سارے ہی افراد اکٹھے بیٹھ کر دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے کینیڈا میں دیکھا کہ پورے پورے کنبے بیٹھے امراؤ جان ادا کے مناظر دیکھ رہے ہیں اور ان پر گفتگو بھی کرتے جارہے ہیں، بس یہی گفتگو میری اس گفتگو کی جان ہے۔

تو اس طرح زبان دبے پاؤں گھروں میں آگئی ہے اور اپنا مقام بنا رہی ہے۔

لیکن یہ محض ایک علاقے کی مثال ہے۔ دنیا میں پھیلی ہوئی اردو کی نئی بستیوں کی مجموعی صورت حال نہیں۔

آیئے، اب اس صورتِ حال پر نگاہ ڈالیں۔

اردو کہاں نہیں ہے۔ کہیں تو تارکین وطن اسے اپنے ساتھ لے کر پہنچے ہیں۔ کہیں مقامی باشندے اپنے اپنے اسباب کی بنا پر اردو سے ناطہ جوڑے ہوئے ہیں۔

اس پورے منظر نامے کا جو کردار ہماری توجہ کا مستحق ہے وہ اردو معاشرے کا وہ فرد ہے جو ان دور افتادہ سرزمینوں میں اردو کا علم اونچا رکھنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ بے شمار لوگ ہیں جو اپنے اپنے طور پر اردو کے فروغ، تعلیم اور ترویج کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہی لوگ میرے اس مقالے کا مرکزی کردار ہیں۔

جو لوگ اردو کی سرزمین سے ہزاروں میل دور رہ کر اردو کو رواج دینے کی جدوجہد میں لگے ہیں، چاہے وہ مشاعرے کرا رہے ہو چاہے اردو کے ویک اینڈ اسکول چلا رہے ہوں، اردو کے اخبار اور رسالے نکال رہے ہوں یا اردو کے ریڈیو اور ٹیلی وژن اسٹیشن چلا رہے ہوں، وہ ہماری غیر معمولی توجہ چاہتے ہیں۔

ان سے بھی بڑھ کر وہ افراد ہیں جو انفرادی طور پر اپنے گھروں میں نوعمر لڑکے لڑکیوں کو اردو پڑھانا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو سائنسی بنیادوں پر جدید اصولوں کے مطابق کتابیں اور دوسرا تعلیمی مواد فراہم کرنا اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

اس کے بعد وہ لوگ آتے ہیں جو دستیاب تعلیمی مواد حاصل کر کے از خود اردو سیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اب یہ سہولتیں کتابوں کے علاوہ کمپیوٹر میں بھی دستیاب ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاک کے ذریعے گھر بیٹھے اردو سیکھنے کا سلسلہ ہے جو دنیا کے بعض علاقوں میں ہی دستیاب ہے اور مقبول بھی ہے۔

آج میرا اصرار اس بات پر ہے کہ دنیا میں اردو کو زندہ رکھنے کے لئے بڑے پیمانے پر اور تعلیم کے جدید اصولوں پر کام کے ایسے مرکز قائم کئے جائیں جنہیں ضرورت بھر وسائل حاصل ہوں اور پھر یہ کام تن دہی سے، یک سوئی سے کیا جائے۔

میری ایک تجویز تو یہ ہے کہ دو بنیادی کتابیں تیار کی جائیں۔ ایسی کتابیں جن کی نوعیت علاقائی نہیں، آفاقی ہو۔ وہ ڈربن ہو یا تاشقند، ماریشس ہو یا ماسکو، وہ مدرسہ ہو یا کلب، مسجد ہو یا گھر، ایک کتاب ایسی ہو کہ جس کے ذریعے ذرا سی مدد اور رہ نمائی سے بنیادی اردو سکھائی جائے۔

میرا مسلسل اصرار رہا ہے کہ ابھی ایک چھت کے نیچے وہ دو نسلیں موجود ہیں جو زبان کا ورثہ منتقل کر سکتی ہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ وقت ضائع کئے بغیر اس نعمت سے استفادہ کر لیا جائے۔

دوسری کتاب ان لوگوں کے لئے تیار کی جائے جنہیں رہ نمائی دستیاب نہیں اور جو ذاتی محنت سے خود کو اردو سکھانے پر آمادہ ہیں۔ یہ کتاب ایک سے زیادہ زبانوں میں ہو سکتی ہے تا کہ ہر علاقے اور خطے کا طالب علم اس سے فائدہ اٹھائے۔ یہ کتاب کاغذ پر ہونا ضروری نہیں۔ یہ کتاب

کمپیوٹر میں بھی ہو سکتی ہے اور اس طرح صرف حروف ہی نہیں بلکہ صحیح تلفظ اور لہجہ بھی سکھا سکتی ہے۔ پھر اس کی تشہیر کا ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ دنیا بھر میں اردو سیکھنے کے مشتاق اس کو حاصل کر سکیں۔

میری دوسری اور بڑی تجویز ایک طرح سے پہلی تجویز کو مستحکم بنیاد فراہم کر سکتی ہے۔ میری رائے ہے کہ جس طرح ترقی اردو کی علاقائی انجمنیں کام کر رہی ہیں، مثلاً انجمن ترقی اردو، ہند یا انجمن ترقی اردو پاکستان، اسی طرح ایک عالمی انجمن ترقی اردو کا قیام اشد ضروری ہے۔ یہ ایک ایسا ادارہ ہو جو دنیا بھر میں ان افراد، اداروں، تنظیموں اور حکومتوں سے رابطہ رکھے اور ان کا ہاتھ بٹائے جو اپنے ہاں اردو کو فروغ دینے کے لئے کوشاں ہیں۔

اس وقت یہ افراد یا ادارے اپنے اپنے طور پر اور اس سے بھی بڑھ کر اپنی اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اردو کی تعلیم اور فروغ کے لئے کام کر رہے ہیں۔ بیشتر کو صحیح پیشہ ورانہ مشاورت حاصل نہیں۔ کوئی ان کی رہ نمائی نہیں کر رہا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کوئی ان کو جدید تعلیمی مواد فراہم نہیں کر رہا ہے۔

میں نے برطانیہ کے ایک بڑے مدرسے میں وہیں پیدا ہونے والے نوعمر بچوں کو اردو پڑھتے دیکھا جو پاکستان کے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی تیار کی ہوئی درسی کتاب میں پڑھ رہے تھے کہ بڑھئی اپنی دیہاتی خراد پر لٹو کیسے بنا رہا ہے۔ ان کتابوں میں کوئی نقص نہ تھا۔ لیکن یہ ایک خاص علاقے اور ایک خاص معاشرت کے لئے تیار کی گئی تھیں۔ بعض کتابیں تو پنجاب کے دیہات کے مدرسوں کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہوں گی جنہیں برطانیہ کے بچے پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ اگر کہیں ان بچوں کو ایسی جدید اور دل کش کتابیں میسر ہوں جو مغربی معاشرے کو نگاہ میں رکھ کر تیار کی گئی ہوں تو بچوں اور زبان، دونوں کی قسمت جاگ اٹھے اور اس کے بعد کوئی بچہ اپنے دادا ابا سے نفرت نہ کرے۔

ایسے اداروں اور ایسے معاشرے کے بچوں کو اعلیٰ درسی کتابیں فراہم کرنے کا کام کوئی اعلیٰ ادارہ ہی سرانجام دے سکتا ہے جس کے وافر وسائل کی بات میں نے یوں کہی تھی کہ مجھے دو

واقعات کا علم ہے۔

اول تو ازبکستان میں بچوں کو اردو تعلیم دینے کا چلن تھا کہ اس زبان کے تناور درخت کی جڑیں وسطی ایشیا تک پھیلی ہوئی ہیں۔ مگر ان لوگوں کو مناسب اور جدید تعلیمی مواد درکار تھا۔ انہوں نے کسی سے مدد مانگی جو نہیں ملی۔ پھر انہوں نے کسی اور سے ہندی زبان کی تعلیم کا مواد مانگا جو بکسوں کے حساب سے بھر کر وہاں پہنچ گیا اور جتنا مانگا تھا اس سے زیادہ پہنچا۔ حیرت ہوتی ہے کہ قدرت نے یہ ظرف آدمی کو بھی بخشا ہے، مگر بدقسمتی سے وہ ہمارا آدمی نہیں۔

بالکل ایسی ہی مثال بحرِ ہند کے دور افتادہ جزیرے ماریشس کی ہے جہاں اردو کی تعلیم کا خوب خوب رواج ہے لیکن یہ سارا کام وہ لوگ بیرونی مدد کے بغیر کرتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ انہوں نے ایک ملک کے حکام سے جب کبھی مدد مانگی، وعدوں کے سوا کچھ نہ ملا۔ البتہ ایک دوسرے ملک سے ہندی کا تعلیمی مواد مانگا تو نہ صرف وہ ملا بلکہ ساتھ میں اردو کتابوں سے بھی ان کا کتب خانہ بھر دیا گیا۔

یہ صرف دو مثالیں ہیں پر یہ مسئلہ دور تک جاتا ہے اور اپنے حل کے لئے اردو کے بہی خواہوں کی طرف صرف نظر ہی نہیں کرتا، حسرت کی نظر کرتا ہے۔

پُل پر جا

یہ بات زیادہ پرانی نہیں۔ لندن کا ایک بڑا اردو روزنامہ نئے سال کا خصوصی شمارہ نکالنے والا تھا۔ اس کی تیاری کے سلسلے میں ایک سروے ہو رہا تھا اور شہر کے شاعروں اور ادیبوں سے پوچھا جا رہا تھا کہ آپ نے یہ گزر جانے والا سال کیا کرتے ہوئے گزارا؟

مجھ سے بھی یہی سوال کیا گیا۔ میں نے جواب دیا۔ ''بچوں کے قاعدے پڑھ کر اپنی اردو بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہوئے گزارا۔''

اخبار والے سمجھے کہ میں نے کوئی مذاق کیا ہے۔ اس کے جواب میں انہوں نے اور بڑا مذاق کیا اور میرا جواب اپنی طرف سے گھڑ دیا۔ ''میں نے یہ سال شیر دریا میں تیرتے ہوئے گزارا۔''

اب انہیں کون بتائے اور کون یقین دلائے کہ وہ سال میں نے بچوں کے قاعدے پڑھتے ہوئے ہی گزارا تھا۔

اس کا قصہ یہ ہے کہ میں کچھ قاعدے لکھنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس سے پہلے میں نے

ہندوستان اور پاکستان سے بچوں کے جتنے بھی قاعدے دستیاب تھے وہ سارے کے سارے خریدے اور گھر لا کر ان کا مطالعہ شروع کیا۔ اس طرح میں خود اپنی تربیت کرنا چاہتا تھا۔ میں یہ نہیں جاننا چاہتا تھا کہ قاعدے لکھتے ہوئے مجھے کیا کرنا چاہئے بلکہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ قاعدے لکھتے ہوئے مجھے کیا نہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ اس مطالعے نے مجھے بہت کچھ سکھایا ہی نہیں بلکہ میری آنکھیں کھول دیں۔ ان قاعدوں نے میری ذاتی لغت میں جیسے جیسے اضافے کئے میں ہی جانتا ہوں۔

مثال کے طور پر جب ہم گھر کے لڑکے باڑھ پر تھے اور بہت زیادہ کھانے لگے تھے تو اماں کہا کرتی تھیں کہ تم لوگ حواصل ہو گئے ہو۔ ظاہر ہے لفظ حواصل کے معنی دیکھنے کے لئے لغت کی طرف دوڑنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ لفظ اپنے معنی خود دے رہا تھا اور ہمیں یقین تھا کہ بہت زیادہ کھانے والے کو حواصل کہتے ہیں۔ یہ تو اب اس پختہ عمر میں بچوں کے ایک قاعدے میں ح سے حواصل پڑھا اور اس کے ساتھ ایک پرندے کی تصویر بھی دیکھی تب معلوم ہوا کہ حواصل ایک پرندے کو کہتے ہیں جس کا پیٹ آگے کو نکلا ہوتا ہے اور ممکن ہے وہ خوش خوراک بھی ہو، یا شاید باہر کو نکلے ہوئے پوٹے کی مناسبت سے یہ قیاس کر لیا گیا ہو کہ وہ بہت کھاتا ہے، لہٰذا اس کے ناطے ہم لوگ بھی حواصل ٹھہرائے گئے۔

اسی کتاب میں ہم نے ایک نیلے پھول کا نام سیکھا اور وہ تھا کوکنار۔ کتاب میں ہم نے لالہ دیکھا اور گلِ داؤدی بھی دیکھا۔ بچوں کو یہ چیزیں کون سکھاتا ہے۔ یہی جاننے کے لئے ہم نے لاہور میں کتاب کے ناشر امپیریل بک ڈپو کے مالک اشرف ملک صاحب کو فون کیا اور کہا یہ آپ کا یہ قاعدہ تو نہایت اچھا ہے۔ ہمارے خیال میں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہا ہوگا۔ اپنے مخصوص لاہوری لہجے میں بولے۔ ”کوئی نہیں جی۔ ہم نے تو اسے چھاپنا ہی بند کر دیا ہے“۔

ہم نے سبب پوچھا تو کہنے لگے۔ ”کوئی اسکول والا اسے لگاتا ہی نہیں اس لئے یہ چلتا نہیں۔ ہم بھی نہیں چھاپتے“۔

ہم نے پوچھا کہ کچھ اور قاعدے یا بچوں کی کتابیں چھاپتے ہیں آپ؟

جواب ملا۔ ''نہیں جی۔ ہم نے اب کتابیں چھاپنی ہی بند کردی ہیں کیونکہ کوئی خریدتا ہی نہیں''۔

ہم نے کہا۔ ''اس قاعدے کی مصنفہ تھری ٹی ہرسجی کون خاتون ہیں؟ کیا ان کا کوئی فون نمبر ہے آپ کے پاس؟''

''نہیں جی، تین چار سال سے ان سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ یہیں لاہور میں رہتی ہیں، ٹیچر ہیں، اس کے سوا کچھ پتہ نہیں ان کا۔''

سچ تو یہ ہے کہ ایک انہی کا کیا، قاعدے اور بچوں کی ابتدائی کتابیں لکھنے والے کتنے ہی لوگوں کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ کچھ پتہ نہیں ان کا۔ اس کی بات کسی دوسری جگہ ہوگی، پہلے قاعدوں سے آج تک کچھ نہ کچھ سیکھنے کا ذکر ہو جائے۔

ایک قاعدے میں ہم نے ذ سے ذقن پڑھا۔ اس طرح کے لفظ اردو شاعری میں پڑھے تھے، قاعدوں میں نہیں، بلکہ بے قاعدوں میں بھی نہیں۔ چاہِ ذقن اور چاہِ یوسف سے اتنا تو سمجھ میں آتا تھا کہ غالباً کنویں کو کہتے ہیں لیکن ننھے بچوں کے قاعدے میں ذ سے ذقن پڑھا اور سامنے انسانی ٹھوڑی کی تصویر دیکھی تو شبہ یہ گزرا کہ ہو یا نہ ہو اسی کو ذقن کہتے ہوں گے اور نازنینوں کی ٹھوڑی میں وہ جو چھوٹا سے گڑھا ہوتا ہے شاعر حضرات اسی کو ذقن کا کنواں باندھتے ہوں گے اور موقع محل دیکھ کر اس میں ڈوب بھی جاتے ہوں گے۔

لفظ غلام سے ہم واقف تھے۔ دو سو سال تک ہمارے بزرگ تو آداب غلامی سے بھی واقف رہے لیکن بچوں کے ایک قاعدے میں غ سے غلام دیکھ کر اتنی حیرت نہیں ہوئی جتنا تعجب اس کے سامنے بنی ہوئی تصویر دیکھ کر ہوا کہ ایک شخص زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، بوجھ ڈھو رہا ہے اور اس کی پشت پر تازیانہ بھی لگ رہا ہے۔ اس قاعدے میں اگر پ سے پشت اور ت سے تازیانہ بھی ہوتا تو بچوں کی اور بہتر تربیت ہو جاتی۔

ایک بہت اچھا قاعدہ دیکھا۔ اس کا نام تھا چاند تارے اور اس میں حروف تہجی بڑے

سلیقے سے سکھائے گئے تھے۔ اللہ، رسولؐ، قائداعظم، علامہ اقبال اور قومی ترانے کو وہیں جگہ دی گئی تھی جہاں دی جانی چاہئے البتہ جہاں قاعدہ ختم ہوا اور کوئی دو انچ جگہ بچی وہاں غالباً کاتب نے اپنی طرف سے یہ اضافہ کر دیا۔ ''نصیحت۔ پتنگ اڑانے والے اچھے بچے نہیں ہوتے۔ پتنگ اڑانے والے بچوں کو استاد اور ماں باپ پسند نہیں کرتے۔''

تو یہ تھا پورے قاعدے کا بے قاعدہ حاصل۔

'اچھے بچوں کا اچھا قاعدہ' دیکھنے میں اتنا اچھا ہے کہ ہر صفحہ آئینہ نظر آتا ہے۔ اس میں ہم نے ث سے ثور سیکھا۔ جنہیں علم نہ ہو کہ ثور کیا ہوتا ہے وہ بازار جا کر اسے خریدنے کی زحمت فرمائیں۔ ذ سے اکثر قاعدوں مے ذخیرہ ہوتا ہے، اس میں ذرہ لکھا ہے اور ایک محدب شیشے کے راستے کچھ ذرے دکھائے گئے ہیں جن پر بھنے ہوئے چنوں کا گمان ہوتا ہے۔ اس قاعدے نے ہمارے علم میں جو بڑا اضافہ کیا وہ ژ سے ژولیدہ تھا۔ مطلب تو ہمیں اب بھی نہیں پتہ لیکن سامنے بنی ہوئی تصویر سے خیال ہوتا ہے کہ گھونگریالے بالوں کو کہتے ہوں گے۔ بہرحال آگے چل کر شاعر بننے والے بچے یوں نہیں سیکھیں گے تو کیونکر سیکھ پائیں گے۔

اسی طرح کفایت تصویری قاعدہ ہے۔ یہ نئے زمانے کا قاعدہ ہے اس لئے اس میں ب سے بندر یا بکری نہیں بلکہ ب سے بم ہے۔ ایک اور قاعدہ جو ہمارے ذخیرے سے کوئی چرا کر لے گیا بالکل ہی جدید زمانے کا ہے۔ اس میں بچوں کو جہاں سات کا ہندسہ سکھایا گیا ہے وہاں سات خرگوش دکھائے گئے ہیں اور جو کلاشنکوف تانے ایک دوسرے پر گولیاں برسا رہے ہیں اور کتنے ہی گھائل اور چند ایک مردہ پڑے ہیں۔ مگر کوئی ہم سے اس کا ثبوت نہ مانگے بلکہ یہ سوچنے میں ہمارا ہاتھ بٹائے کہ لے جانے والا سارے قاعدے چھوڑ کر یہی ایک قاعدہ کیوں لے گیا۔ یہ تو ممکن نہیں کہ لفظ القاعدہ ہمارے اُسی قاعدہ سے نکلا ہو۔

ہندوستان میں شائع ہونے والے قاعدوں پر گفتگو کرتے ہوئے خیال آتا ہے کہ وہاں بچوں، والدین اور اساتذہ کے مسائل مختلف ہیں اس لئے ان کا تدریس کا انداز بھی جدا ہے لیکن حیدرآباد دکن سے شائع ہونے والے ایک قاعدے کے مصنف نے تو اپنا قاعدہ لکھتے ہوئے

قاعدے قانون کا بے حد خیال رکھا ہے۔ یہ قاعدہ کھولتے ہی مصنف کا یہ دعویٰ پڑھنے میں آتا ہے کہ یہ قاعدہ پرائمری جماعتوں کے لئے جدید اصول تعلیم کے پیش نظر 'دیکھو اور بولو' کے طریقے پر مرتب کیا گیا ہے۔

اصولاً یہ ہونا چاہئے تھا 'پڑھو اور گاؤ'۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ ننھے بچوں کے ہاتھ میں دی جانے والی کتاب میں الف بے لکھا جائے، اس میں 'جن گن من ادھی نایک جئے ہے، بھارت بھاگیہ ودھاتا' لکھا گیا ہے۔ اس کے فوراً بعد والے صفحے پر ایک مضمون ہے جس کا عنوان ہے ''ہندوستانی بچے کا عہد''۔ ننھے قاری کو ذہن میں رکھتے ہوئے وہ بھی پڑھنے کی چیز ہے۔

اب ذرا سوچئے کہ ننھے بچے یا بچی کو ماں نے نہلا دھلا کر، صاف ستھرے کپڑے پہنا کر، بال سنوار کر اور رخسار پر سرمے کا تل بنا کر اسکول بھیجا ہے جہاں اس سے یہ عبارت پڑھوائی جا رہی ہے: ''آج میں اپنے شفیق و مہربان استاد کے سامنے یہ عہد کرتا ہوں کہ تعلیم حاصل کرنے میں کبھی سستی یا کاہلی سے کام نہ لوں گا، بلالحاظ موسم وقت کی پابندی میرے فرائض میں شامل رہے گی۔۔ وغیرہ وغیرہ۔۔ میں اپنے وطن ہندوستان کی عزت و ناموس کا احترام کروں گا۔۔۔ ہمارا قومی جھنڈا ترنگے کی عزت اور اس کی بقا و سلامتی کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دینا میری زندگی کا اوّلین مقصد ہوگا۔''

اس کے نیچے یہ تو نہیں لکھا ہے کہ بچہ انگوٹھے کا نشان لگائے البتہ اس کا نام، باپ کا نام، عمر، قوم (خود ہی ہندوستانی لکھ دیا گیا ہے) نام مدرسہ اور مکان کا پتہ درج کرایا گیا ہے تاکہ بچہ کسی مرحلے پر مکر نہ جائے یا فرار نہ ہو جائے۔

جس حیدر آباد دکن میں مولوی شیخ چاند محمد صاحب کا بولتا قاعدہ لکھا گیا اور جس ہندوستان میں خان صاحب مولوی محمد اسماعیل کا قاعدہ تصنیف ہوا، وہاں اس طرح کی کتابیں دیکھ کر اور تو کچھ نہیں ہوتا، بس ایک ذرا سا دل دکھتا ہے۔

شیخ چاند اور اسماعیل میرٹھی کا ذکر کسی مناسب جگہ ہوگا، یہاں ذرا سی آپ بیتی کہہ سناؤں تو بے جا نہ ہوگا۔

میں نے جب پڑھنا شروع کیا تو میں تنہا نہ تھا۔ میرے بڑے بھائی تعلیم میں مصروف تھے اور ان کے ساتھ لگ کر میں نے جلد ہی کتابوں سے جی لگالیا۔ مجھے یاد ہے کہ ہم سب بھائیوں کے لئے لکھنو سے دینیات کی کتابیں منگائی گئیں۔ ان میں قیامت کی افراتفری، ماں باپ سے بچھڑ جانے، بال سے زیادہ باریک، تلوار سے زیادہ تیز دھار اور آگ سے زیادہ گرم پُل پر پار اترنے کی لازمی آزمائش کو احوال پڑھ کر مجھے اپنے چھوٹے سے دل کا دھڑکنا اب تک یاد ہے۔ قبر میں دائیں بائیں کھڑکیاں کھلنے، دو فرشتوں کا نمودار ہونے اور تین سوال کرنے کا منظر آج تک نگاہوں میں سمایا ہوا ہے۔ اور یہ بھی یاد ہے کہ ایک جواب بھی غلط ہوا تو فرشتے آگ کے گرز سے ماریں گے۔ اُس وقت وہ تین جواب رٹنے کی جو معصوم سی کوشش میں نے کی تھی وہ میرے ذہن سے کبھی محو نہ ہو سکی۔

دینیات کی ان کتابوں سے بھی پہلے میرے لئے اسی لکھنو سے قاعدہ منگایا گیا۔ بچپن کی یادیں دماغ میں ایسی چپکتی ہیں کہ عمر بھر مٹنے کا نام نہیں لیتیں۔ وہ قاعدہ کیا تھا، واقعہ کربلا کا منظر نامہ تھا۔ الف سے اذان، ب سے بالیاں، پ سے پٹکا، ت سے تلوار، خ سے خیمہ، ذ سے ذوالجناح، ع سے علم، م سے مشک، ن سے نیزہ، ق سے قید خانہ، کچھ اس طرح کے حروف سے ایسے ایسے لفظ بنائے گئے تھے کہ ہمارے گھر میں ایک بہت پرانا اور ضعیف ملازم تھا جو قاعدے کی یہ عبارت سن کر پھوٹ پھوٹ کر رویا کرتا تھا۔

چلئے یہ کتاب حکومت سے منظور شدہ تو نہ تھی۔ مجھے یاد ہے میری بیٹی رباب چھ کی ہو کر ساتویں برس میں لگی تھی اور کراچی میں ناظم آباد کے ایک پرائیوٹ اسکول میں پڑھنے جاتی تھی۔ وہاں اسے اسلامیات کی ایک کتاب دلوائی گئی جس کا اسکول ہی سے خریدا جانا لازمی تھا۔ وہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری البتہ رباب کو پڑھائی جانے لگی۔ کچھ روز گزرے ہوں گے کہ ایک روز اسکول سے آکر اس چھوٹی سے لڑکی نے مجھ سے پوچھا کہ غسل جنابت کیا ہوتا ہے؟

مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ہماری طرف اسے غسل ندامت کہتے ہیں۔

میں نے رباب کی وہ کتاب اس کے بستے سے نکال کر دیکھی اور یہ سوچ کر مجھ پر سکتہ سا

طاری ہو گیا کہ آنے والے دنوں میں میری بچی مجھ سے اور کیا کیا پوچھے گی۔

ہم نے رباب کو اس اسکول سے اٹھالیا اور کچھ فاصلے پر ایک مشنری اسکول میں داخلے کے لئے لے گئے۔ نیا نیا اسکول کھلا تھا۔ اسکول والوں نے بچی سے کچھ واجبی سوال پوچھے، اس نے ذہانت سے جواب دیئے۔

اس کے بعد میں نے ایک سوال کی اجازت مانگ کر ان سے کہا کہ آپ کے ہاں اسلامیات کی جو کتاب پڑھائی جاتی ہے کیا وہ حکومت سے منظور شدہ ہے؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے وہ کتاب میرے سامنے رکھ دی۔ میں نے پہلا ورق کھولا جو مجھے آج تک یاد ہے، اس میں کچھ اس طرح کی عبارت تھی کہ یہ جو ہوائیں چلتی ہیں، یہ جو پھول کھلتے ہیں، یہ جو گھٹائیں اٹھتی ہیں، یہ جو بارش برستی ہے، یہ جو پرندے گاتے ہیں اور یہ جو پانی میں رنگ رنگ کی مچھلیاں تیرتی ہیں، یہ سب نعمت ہیں جو ہمارے لئے ہمارے خدا نے بنائی ہیں۔

مجھے اپنی درجہ ب کی پہلی کتاب یاد آ گئی۔ یہ بات غالباً ۱۹۴۲ء کی ہے۔ جنگ عظیم زوروں پر تھی۔ برصغیر میں بچوں کے لئے نئے نئے نصاب لکھے جا رہے تھے کیونکہ بیک وقت ہندو بچوں کا خیال رکھنا تھا اور مسلمان بچوں کا بھی۔

لیجئے، میں آج باسٹھ سال بعد اپنی اُس پہلی کتاب کا پہلا سبق آپ کو سناتا ہوں۔ صفحے کے بالائی حصے میں دریا اور پہاڑوں کے پیچھے سے ابھرتے ہوئے سورج، کشتیوں، پرندوں، درختوں اور پھولوں کی قلمی تصویر تھی اور اس کے نیچے لکھی ہوئی عبارت کا ایک ایک حرف مجھے ازبر ہے۔

''خدا ایک ہے۔ وہی رام ہے۔ اُسی نے سب کو پیدا کیا۔ سورج بنایا، چاند بنایا۔ دنیا کی ہر چیز بنائی، ہم سب اس کی پوجا کرتے ہیں۔''

سارے بچے کسی تخصیص کے بغیر یہ سبق پڑھ رہے تھے۔ نہ مندروں میں مخالفانہ نعرے لگ رہے تھے، نہ مسجدوں میں احتجاجی خطبے پڑھے جا رہے تھے، نہ جلسے ہو رہے تھے اور نہ جلوس نکل رہے تھے۔ سب اسی کے عبادت کر رہے تھے جس کے بارے میں اس سے بڑی صداقت اور

اس سے بڑا اعلان اور کیا ہو گا کہ وہ ایک ہے۔

کیسے زمانے تھے، کیسے دیکھتے دیکھتے خاکِ فنا میں رُل گئے۔

اور یہ بات بھی غالباً ۱۹۴۲ء ہی کی ہے، حیدر آباد دکن میں بولتا قاعدہ لکھا گیا۔ مولوی شیخ چاند محمد صاحب بی اے، ماہر درسیات تھے۔ انہوں نے حروف تہجی سے شناسائی کا فرسودہ نظام منسوخ کیا، بغدادی قاعدے سے ملتے جلتے اردو کے قاعدے جن میں سارا زور حروف کے ملنے سے بننے والے سینکڑوں بے مقصد اور بے تکے الفاظ پر تھا، انہیں ساقط قرار دیا۔ مولوی صاحب نے جماعت میں با بَب بِب بُب اور جا جَب جِب جُب کی مسلسل گردان کرنے والے بچوں پر ترس کھایا اور وہ انقلابی بولتا قاعدہ ترتیب دیا جو دکن میں آج بھی رائج ہے اور جس سے تدریس کے نظام کی کایا پلٹ گئی ہے۔

مولوی صاحب نے، جنہیں اہل دکن شیخ چاند صاحب کہتے ہیں اردو تدریس کا آغاز حروف سے نہیں، الفاظ سے کیا۔ انہوں ے بچوں کو الف بے اور پے پڑھوانے کی بجائے آم دو سے تدریس کا پہلا ورق کھولا۔ دوسرے صفحے پر لفظ تالا اور تیسرے پر لفظ باجا سکھایا۔ اس کا سیدھا سادا اصولِ یہ تھا کہ بچوں کو صرف اتنا بتایا جاتا تھا کہ دیکھو۔ یہ آم لکھا ہے، یہ دو۔ یہ تالا لکھا ہے اور یہ باجا۔

جو بچے ۳۶ سے بھی زیادہ آڑی ترچھی شکلوں کی بے نام اور بے معنی بھول بھلیوں میں کھو جاتے تھے اب ان کے ذہن میں ایک شیریں اور لذیذ پھل لفظ کی شکل میں ڈھلا۔ گھر کے دروازے یا صندوق سے آویزاں تالے کو انہوں نے لکھا ہوا دیکھنا سیکھا اور چابی بھر کر ریکارڈ بجانے والے جس باجے کو وہ بجتے ہوئے دیکھتے تھے اب اسے لکھا ہوا پایا۔ اور اس طرح ۲۸ سبق پورے ہونے تک ننھا طالب علم اپنی زبان کے بنیادی لفظ نہیں سیکھا بلکہ لفظوں پر نگاہ پڑتے ہی انہیں شناخت کرنے کا ہنر سیکھ گیا۔

دنیا میں ہزار طرح کی نیکیاں ہوتی ہوں گی، لیکن وہ نیکیاں سب سے اعلیٰ اور افضل ہیں

جن کے شگوفے ذہانت کی شاخ سے پھوٹتے ہیں۔

بولتا قاعدہ کا جو نسخہ میرے سامنے ہے اس کے سرورق پر لکھا ہے، 'اردو زبان میں اپنے طریقہ کا پہلا بولتا قاعدہ جس کو شہزادہ کرنل نواب مکرم جاہ بہادر کے مطالعے کا شرف حاصل ہے'۔

میں نہ ہوا ور نہ لکھتا: پہلا قاعدہ جس کے مطالعے کا شہزادہ موصوف کو شرف حاصل ہے۔

پھر میری کمسن بیٹی کا ذکر آ رہا ہے لیکن میں کیا کروں کہ میری دانائی کی رسد گاہ میں تجربے، تشخیص اور تحقیق کا آلہ وہی نو عمر لڑکی تھی۔

جوں ہی اس نے اسکول میں پڑھنا شروع کیا اسے ایک قاعدہ دیا گیا جو کراچی کی اردو اکیڈمی، سندھ نے شائع کیا تھا اور جس کا نام ہی 'باجا تالا' تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ رباب تیسرے چوتھے ہفتے ہی چھوٹے چھوٹے لفظ پہچاننے لگی۔ اُس وقت مجھے علم نہ تھا کہ اردو اکیڈمی کو یہ فیضان شیخ چاند صاحب سے نصیب ہوا۔

بولتا قاعدہ اگرچہ دکن کی مسلم ریاست میں لکھا گیا اور رائج ہوا لیکن اس میں پہلے پڑھنے کا بنیادی گُر سکھایا گیا، دین اور اخلاق کی تعلیم کو ذرا آگے سرکا کر مناسب وقت کے لئے اٹھا رکھا گیا۔ پہلا قاعدہ کا پہلا کردار راجا سولھویں سبق میں آتا ہے جس کے سر پر تاج ہے۔ اگلے سبق میں حسن کوزہ گر تو نہیں لیکن حسن حقہ نوش نظر آتا ہے اور وہیں پدما چرخا چلاتی ہے۔ اگلے ورق پر ذاکر ڈول ڈالتا ہے اور بیسویں سبق میں رام نے سارس پالا ہے۔ بائیسویں سبق میں طاہر، ظفر اور علی باغ کو جاتے ہیں۔ ایک ورق بعد قاسم اور صادق نمودار ہوتے ہیں، بالآخر چڑیا کو پانی پینے اور مور کو دانہ کھانے کا مشورہ دیتے ہوئے یہ قاعدہ جب اپنے خاتمے کو پہنچتا ہے تب کہیں جا کر الف سے ے تک سارے حروف پڑھاتا ہے مگر اس پیغام کے ساتھ کہ علم میں مذاہب اور عقیدوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں۔

شیخ چاند صاحب کے اس قاعدے نے ایسا رواج پایا کہ ناظم تعلیمات نے ماہرین کی ایک کمیٹی بٹھا کر اسے یہ فرض سونپا کہ اسے اور زیادہ سائنسی بنیادوں پر استوار کرے چنانچہ ڈاکٹر

سید محی الدین زور کی صدارت میں چار اعلیٰ معلم بیٹھے اور اسے مزید سنوارا۔

دکن میں آج ۶۲ برس بعد بھی بچے یہی قاعدہ پڑھ رہے ہیں۔ وہ جن گن من ادھی نا یک جئے ہے بھی گاتے ہوں گے مگر بے پڑھے لکھے نہیں۔

اور اب ہم پیچھے چلتے ہیں لیکن حقیقتاً آگے بڑھتے ہیں۔

میری بڑی بہن کہا کرتی تھیں کہ سر سید نہ ہوتے تو ہم لوگ بے علم ہوتے اور اسماعیل میرٹھی نہ ہوتے تو ہم بے ادب ہوتے۔

اس کتاب کے اگلے اوراق میرٹھ کی خاک سے اٹھنے والی اسی عظیم ہستی کے نام میری عقیدت کا خراج ہیں۔

ہمارے گھر کا رواج یہ تھا کہ اگرچہ اسماعیل میرٹھی کا قاعدہ اور اردو کی پانچ ابتدائی کتابیں اسکولوں میں پڑھانے کا سلسلہ ترک ہو چکا تھا مگر میری بڑی بہن گھر کے سارے بچوں کو سردیوں کی دھوپ میں بٹھا کر یہ کتابیں پڑھایا کرتی تھیں اور مجھے یاد ہے کہ جب میں مولانا کی ایک نظم فر فر سنا دیتا تھا کہ

نہر پر چل رہی ہے پن چکی — دھن کی پوری ہے کام کی پکی
بیٹھتی تو نہیں کبھی تھک کر — تیرے پہیے کو ہے سدا چکر
پیسنے میں نہیں لگی کچھ دیر — تو نے جھٹ پٹ لگا دیا اک ڈھیر
لوگ لے جائیں گے سمیٹ سمیٹ — تیرا آٹا بھرے گا کتنے پیٹ

اور جب میں آخری شعر ختم کر کے گہری سانس کھینچتا تھا، باجی اسماعیل میرٹھی ہی کا یہ شعر ضرور پڑھا کرتی تھیں:

واہ وا شاباش لڑکے، واہ وا — تو جواں مردوں سے بازی لے گیا

میری بھانجیاں لہک لہک کر 'ایک لڑکی بگھارتی ہے دال' پڑھتی تھیں اور جب تک دال کھیت میں لہرانے کا ذکر چلتا تھا وہ بھی لہراتی تھیں، پھر فصل کٹنے اور دال کے چکی میں ڈالے جانے اور دلے جانے کا احوال فریاد کی شکل اختیار کر لیتا تو سب سے چھوٹی والی آنسوؤں سے

رونے لگتی تھی۔ اس کے بعد دال کے پکنے، نمک مرچ ڈالے جانے اور بگھار لگنے کی نوبت آتی تھی تو لڑکیاں ہاتھوں کے اشارے سے یہ سب کچھ کر کے دکھاتی تھیں اور بالآخر جب لڑکی دال کی ڈھارس بندھاتی ہے اور دعویٰ کرتی ہے کہ میں تو رتبہ ترا بڑھاتی ہوں، اب چپاتی سے تجھ کو کھاتی ہوں، تو اس مقام پر پہنچ کر وہی چھوٹی والی یہ صدا ضرور لگاتی تھی کہ 'اماں بھوک لگی ہے'۔

خان صاحب مولوی محمد اسماعیل کی ان کتابوں نے کئی نسلوں کے ذہن کی جو تربیت کی ہے اور اخلاق کو باتوں ہی باتوں میں جس طرح سنوارا ہے، ہمیں اس کا ادراک ہو جائے تو تشکر کا حق ادا کرنا بھی چاہیں تو نہ کر پائیں۔

یہاں کیوں نہ یہ بھی دیکھتے چلیں کہ وہ کیسے حالات تھے جنہوں نے اسماعیل میرٹھی کو ایسی بے مثال کتابیں لکھنے پر اکسایا۔ مولانا کی نوجوانی بہت دشوار زمانے میں گزری۔ وہ سنہ ۱۸۴۴ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے تھے۔ اُس وقت ہندوستان پر انگریزوں کی گرفت غالباً اتنی سخت ہو چلی تھی کہ رعیت کا دم گھٹنے لگا تھا۔ وہ ۱۴ برس کے تھے اور میرٹھ ہی میں اپنے ایک پڑوسی کے گھر افطار کی دعوت میں شریک تھے کہ ایک شور اٹھا۔ شہر میں سراسیمگی پھیل گئی اور خبر آئی کہ ہندوستانی سپاہیوں نے انگریزوں کی حکمرانی کے خلاف بغاوت کر دی ہے۔ یہ واقعہ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کا تھا۔

عمر کے اس حساس دور میں مولانا نے بغاوت کا علم بلند ہوتے اور پھر اسے بے رحمی سے کچلے جانے کا سارا عمل دیکھا۔ صرف دہلی اور لکھنو ہی نہیں، پورا ہندوستان بری طرح لوٹا گیا اور جن لوگوں پر یہ بپتا برق بن کر گری وہ بے چارے مسلمان ہی تھے۔

وہی دور تھا جب سرسید، حالی اور شبلی جیسے حساس اور دردمند دانش وروں نے شکستگی کے احساس کو مٹانے پر کمر باندھی اور ان جیالوں میں اسماعیل میرٹھی برابر کے شریک تھے۔ انہوں نے اگرچہ فارسی پڑھی اور دینی علوم میں جی لگایا مگر جلد ہی جدید علوم کی طرف راغب ہوئے اور نہ صرف انگریزی زبان پر دسترس حاصل کی بلکہ انجینئرنگ کا کورس بھی پاس کیا، لیکن اس کے بعد کوئی اعلیٰ ملازمت ڈھونڈنے کی بجائے انہوں نے تدریس کا رخ اختیار کیا اور ۲۳ برس کی عمر میں ضلع سہارن پور میں فارسی کے استاد رہے اور ۴۳ برس کے سن میں آگرہ جا پہنچے۔ تعلیم دیتے دیتے

انہوں نے شاید زندگی کا بڑا سبق خود ہی سیکھا اور غالباً ۱۸۹۲ء میں اردو زبان کی کتابیں لکھنے کا فیصلہ کیا۔ اُس وقت انہوں نے اردو کا قاعدہ اور پہلی کتاب تیار کر کے خود ہی چھپوائی۔ یہ کتابیں یقیناً ہاتھوں ہاتھ لی گئی ہوں گی چنانچہ تحریک ہوئی اور گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ میرٹھ نہیں گئے بلکہ آگرے ہی میں رہ کر صرف دو مہینوں میں باقی چار کتابیں بھی لکھ ڈالیں۔

وہ دنیا بھر کے موضوعات پر چھوٹے چھوٹے مضمون لکھتے جاتے تھے اور نصیحت آموز نظمیں کہتے جاتے تھے۔ سنہ ۱۸۹۴ء میں ٹیکسٹ بک کمیٹی نے مولانا کی ان کتابوں کو منظوری دے دی اور یو پی کے اسکولوں کو ڈائرکٹر تعلیم کا حکم بھیج دیا گیا کہ تمام بچوں کو یہ قاعدہ اور پانچ کتابیں پڑھائی جائیں۔ اُس وقت یہ کتابیں آگرہ کے مطبع اکبری میں چھپا کرتی تھیں جس کے مالک منشی مجید الدین تھے۔ منشی صاحب ان کتابوں کی طرح نہایت نیک تھے۔ کتابت کا پیشہ کرتے تھے اور کیا عجب کہ بچوں کی ان کتابوں کی خطاطی بڑی شفقت سے کرتے ہوں۔ یہ سلسلہ بارہ تیرہ برس چلا۔ پھر حکومت میں کسی کو خیال آیا کہ ان کتابوں کی زبان دشوار ہے لہٰذا ان کی جگہ یہ درسی کتابیں عام بول چال کی زبان میں لکھوائی جائیں۔ یہ بات سنہ ۱۹۰۷ء ہے۔

تو کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان پر زوال کا سال ۱۹۰۷ء ہے۔ اس سوال پر غور کیا جانا باقی ہے۔

اِس دوران حکومت کی پالیسیاں اور درسی کتابیں بدلتی گئیں جو منظوری کی مدت ختم ہوتے ہی گم نامی کے اندھیروں میں لاپتہ ہوتی گئیں مگر اسماعیل میرٹھی کی کتابیں آج بھی زندہ ہیں اور اس وقت تک ہماری گفتگو کا موضوع بنی ہوئی ہیں۔

میرٹھ والوں نے بجا طور پر مولانا کا نام زندہ اور اونچا رکھا ہے۔ جس محلے میں ان کا گھر تھا وہ اب اسماعیل نگر کہلاتا ہے اور شہر میں دو بڑے تعلیمی ادارے، اسماعیل گرلز انٹر کالج اور اسماعیل گرلز ڈگری کالج آج تک قائم ہیں۔ بیشتر مسلمان لڑکیاں وہیں داخلے کو ترجیح دیتی ہیں، صرف اس لئے نہیں کہ کالجوں کے نام کے ساتھ مولانا کا نام لگا ہوا ہے بلکہ یوں بھی کہ ان کا تعلیمی معیار اونچا سمجھا جاتا ہے۔

ان کا لکھا ہوا اردو قاعدہ صرف پندرہ صفحوں پر مشتمل ہے۔ پہلے آٹھ صفحوں میں تو وہ خود کو بغدادی قاعدے کی فرسودہ الجھنوں سے آزاد نہ کرا سکے اور بچوں کو وہی بابَ بِب بُب اور جا جَب جِب جُب کی پیچیدگیوں میں الجھائے رکھا لیکن اس کے فوراً بعد مولانا نے قدامت کی زنجیریں تڑا کر پھر جو شگفتہ اردو لفظ اور فقرے تراشے ہیں تو کتاب سے پھول جھڑتے ہیں۔ سولہویں صفحے پر پہنچتے پہنچتے ایسے ایسے فقرے پڑھنے میں آتے ہیں جو صاف بتاتے ہیں کہ یہ قاعدہ ہندوؤں کے لئے بھی ہے اور مسلمانوں کے لئے بھی، شہریوں کے لئے بھی ہے اور دیہاتیوں کے لئے بھی، چنانچہ مولانا نے دو دو اور تین تین حروف کے کیسے اچھوتے جملے اور فقرے تراشے ہیں کہ پڑھتے ہی جائیے:

گھاس کھود۔ پاس بیٹھ۔ بات مان۔ کھیت کاٹ۔ راگ چھیڑ۔ رات بہت ہوگئی۔ شہر بہت دور ہے۔ دری بغل میں داب۔ خدا کے سب کام بے عیب ہیں۔ اُس تال کے آس پاس کمر کمر تک گھاس ہے۔ جو دل بدی سے خوش ہو اس میں کوئی روگ ہے۔ سچ میں نفع ہے، سچ میں عزت ہے، سچ ہی زور ہے۔

یہ سب تو ٹھیک ہے مگر جو لطف دو حرفی الفاظ کے جملوں میں ہے وہ پانچوں کتابوں میں بھی نہیں۔ کیوں نہ ان ہی چند جملوں پر یہ گفتگو تمام کریں:

سب سے مل۔ چپ مت رہ۔ دس تک گن۔ خدمت کر۔

اور آخر میں وہ کلاسیکی مشورہ جس کے بغیر اردو زبان کا کوئی قاعدہ مکمل ہی نہیں ہوسکتا:

پُل پر جا۔

ہری تھی، من بھری تھی

یاد داشت کا معاملہ عجب ہے۔ میں نے ہائی اسکول اور کالج میں اردو کی جو ریڈرز پڑھیں، ان کی نوعیت، ان کے متن، کہانیاں اور نظمیں کچھ یاد نہیں۔ لیکن بچپن میں، بلکہ سچ پوچھئے تو سنہ ۱۹۴۳ء میں پڑھی ہوئی اردو کی کتاب کے نقش ابھی تک ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ ہیں۔ اس وقت میری پرائمری اسکول کی تعلیم ختم ہونے کو تھی اور اگلے برس مجھے ہائی اسکول میں چلا جانا تھا۔

دوسری عالمی جنگ کے اُس زمانے میں پرائمری اسکولوں میں ایک نصاب رائج ہوا تھا، مجھے اتنا تو یاد ہے کہ اس میں لفظ 'بیسک' آتا تھا۔ اس نصاب میں تمام ہی مضامین کی کتابیں ہوں گی لیکن مجھے دوسرے درجے کی اردو کی کتاب ذرا ذرا سی یاد ہے، یا یوں کہہ لیجئے کہ اس کا ایک سبق یاد ہے۔

اس سبق کا مضمون یہ تھا کہ مصر میں بچے کا نام کیسے رکھا جاتا ہے۔ اس کا قصہ یہ تھا کہ بچے کی ولادت کے بعد تین شمعیں روشن کی جاتی ہیں اور ہر شمع کو ایک نام دے دیا جاتا ہے۔ جو شمع

آخر تک جلتی رہتی ہے اسی کے نام پر بچے کا نام رکھ دیا جاتا ہے۔

بنیادی تعلیم کا یہ نصاب جامعہ ملیہ، اسلامیہ، نئی دہلی میں ترتیب پایا تھا۔ میں نے اپنی یادداشت کو اور کریدنے کے لئے جامعہ نگر میں اپنے شفیق دوست صدیق الرحمان قدوائی کو ٹیلی فون کیا۔ ان کی یادداشت مجھ سے بہتر نکلی۔ انہوں نے بتایا کہ یوپی کی نظامت تعلیم کے اس بنیادی نصاب میں اردو کی ریڈرز، کوئی صاحب عبادالرحمان تھے، انہوں نے لکھی تھیں۔ جو بھی تھے، خوب تھے، اب خدا جانے کون سے عالم میں ہوں گے، جہاں بھی رہیں خوش رہیں۔

قدوائی صاحب نے اُن ہی دنوں رواج پانے والے تعلیمی تاش اور اردو تاش بھی یاد دلائے۔ کوئی فیاض علی تھے، ممکن ہے انور اور شمیم والے ایڈوکیٹ فیاض علی ہوں، بہر حال انہوں نے تعلیمی تاش بنائے تھے، ان کے ذریعے حروف تہجی سکھائے جاتے تھے جب کہ اردو تاش عبدالغفار مدھولی صاحب نے تیار کئے تھے، ان میں حروف کو جوڑ کر لفظ بنانے کے گر کھیل ہی کھیل میں سکھائے جاتے تھے۔

غرض یہ کہ تعلیمی نظام اپنا چولا بدل رہا تھا، مگر اس سے پہلے کا دور کوئی دورِ جاہلیت نہ تھا۔ اُس وقت اردو کی تعلیم کے سر پر کیسی کیسی بزرگ ہستیوں نے دست شفقت دھرا تھا، آیئے دیکھیں۔

کچھ عرصہ ہوا میں پاکستان کے دورے پر تھا۔ غالباً ملتان میں ایک صاحب میرے پاس آئے اور بولے کہ آپ بی بی سی لندن سے 'دادا کی کتابیں' کے عنوان سے جو پروگرام نشر کیا کرتے تھے اس میں بڑے کمال کی پرانی کتابیں پڑھ کر سنائی جاتی تھیں، کیا وہ پروگرام کتابی شکل میں شائع نہیں ہو سکتا؟۔

یہ سوال سن کر جی خوش ہوا۔ ایک صدی سے بھی زیادہ پرانی اردو کتابوں کا ایک تو قدر دان ملا جسے وہ پروگرام یاد تھا اور وہ کتابیں پڑھنے کا خواہش مند تھا۔ لیکن یہ سوال سن کر جی تھوڑا سا دکھا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ دادا کی پڑھی ہوئی کم سے کم دو کتابیں میں نے لاہور سے شائع کرائی ہیں مگر بہت کم لوگوں کو ان کی خبر ہے۔ محمد حسین آزاد کی بے مثال اور تاریخی ریڈر کا انتخاب 'الٹا

گھوڑا' کے نام سے اور ڈپٹی نذیر احمد کی زندگی کی پہلی کتاب 'ظالم بھیڑیا' کے عنوان سے شائع ہوئی ہیں، مگر ایک مور ہے جو جنگل میں ناچ کر رہ گیا ہے۔

'دادا کی کتابیں' کے عنوان سے میں نے بچوں کے پروگرام شاہین کلب میں عرصے تک پرانی درسی اور غیر درسی کتابوں کے اقتباس نشر کئے تھے۔ اس سلسلے میں انڈیا آفس لائبریری میں بیٹھ کر کافی عرصے چھان بین کی تھی۔ خوش نصیبی سے وہ تمام نقول جو میں وہاں سے لایا تھا، محفوظ ہیں۔ میں سوچتا ہوں کے یہ موقع اچھا ہے کہ ایک سرسری جائزہ لے کر دیکھیں کہ انیسویں صدی میں نئی نسل کے لئے کیسی زبان لکھی جا رہی تھی اور زبان کیسے چلئے بدل رہی تھی۔

اس سلسلے میں سب سے اہم اور قابل ذکر کتابیں محمد حسین آزاد نے لکھی تھیں۔ ایسی نکھری ہوئی، شگفتہ اردو لکھنے کا شرف بہت کم لوگوں کو ملا ہوگا۔ آزاد کے بارے میں سبھی جانتے ہیں کہ ۱۸۳۰ء کے آس پاس کہیں دتی میں پید ہوئے۔ ان کے والد محمد باقر بھی نہایت عمدہ نثر لکھتے تھے۔ انہوں ہی نے ۱۸۳۶ء میں دہلی سے 'اردو اخبار' جاری کیا تھا۔ وہ استاد ذوق کے گہرے دوست تھے اسی لئے آزاد نے شروع ہی سے ذوق کی شاگردی اختیار کی۔ آزاد کو شعر کہنے کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ کوئی ۲۷ برس بعد ان کے والد اس جنگ کی بھینٹ چڑھ گئے جسے غدر کا نام دیا گیا۔ اس کے بعد آزاد کو دہلی سے نکلنا پڑا۔ وہ اس زمانے کے بہت سے لوگوں کی طرح پہلے لکھنو پہنچے اور وہاں شاعروں کو قریب سے دیکھتے ہوئے لدھیانہ گئے۔ کہتے ہیں کہ وہاں وہ ایک چھاپہ خانے میں کتابت کرنے لگے اور بعد میں اسی چھاپہ خانے کے منیجر ہو گئے۔ اب خود ان کی اور اردو زبان کی قسمت انہیں لاہور لے گئی جہاں ڈاک خانے میں پندرہ روپے ماہوار پر سررشتہ دار ہوئے۔

پنجاب میں انگریزوں کا راج قائم ہو چکا تھا اور سکھوں کے دور کی جکڑ بندیاں ختم ہو چکی تھیں۔ مسجدوں میں اذانیں ہونے لگی تھیں، بادشاہی مسجد میں رنجیت سنگھ کا اصطبل ختم کر کے دوبارہ نماز ہونے لگی تھی۔ ذبیحہ بحال ہو گیا تھا اور عام شہریوں کی رضامندی سے بچوں کو گورمکھی کی بجائے اردو میں تعلیم دینے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اب مسئلہ تھا درسی کتابوں کی دستیابی کا۔ اس وقت

لاہور میں میجر فلر ناظمِ تعلیم تھے۔ زبان اور علم کے میدان میں محمد حسین آزاد کی صلاحیتوں کا انہیں علم ہوا تو انہوں نے آزاد کو ابتدائی درسی کتابیں لکھنے کا فرض سونپا۔ اُس وقت اردو کا جو قاعدہ اور تین حصوں میں اردو ریڈرس لکھی گئیں، اِس وقت ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ اس کے ایک ایک لفظ میں شمس العلما مولانا محمد حسین کا لہجہ سنائی دیتا ہے۔

انہوں نے اپنا قاعدہ ۱۸۶۵ء کے قریب لکھا جس میں بچوں کو حروفِ تہجی سکھانے کے بعد دو دو حروف کے لفظ سکھائے گئے۔ چند مثالیں:

یارب اس کی آس ہے۔ دل پر غم ہے۔ وہ بے پر ہے۔ دن کم ہے۔ دم تو لو۔ ہم سے مت لڑ۔ دل سے سن۔ لب پر مت لا۔ آہ مت کر۔ اب بس کر۔ آج ہی کا دن ہے۔ سو یا دو سو لو گے؟۔ سر پر سل رکھ دے۔ اب تم ہو یا ہم۔ بے تگ نہ بک۔ اُس بن کل کب ہے۔ اُس کے لب پر تل ہے۔

پھر تین حروف سے بننے والے لفظوں سے مولانا نے جو فقرے بنائے ہیں، آج تک لطف دیتے ہیں:

کان دھر کے سنو۔ ماباپ کی بات مانو۔ کیا ہرا باغ ہے۔ آج رات کو رہ جا۔ مزا جب تھا کہ تم بھی چلتے۔ آج کی رات خوب کٹی۔ بہت سود نہ لو۔ اجی تم کون ہو۔ اس کو بڑے جوڑ توڑ یاد ہیں۔ تو ڈال ڈال ہے تو میں پات پات ہوں۔ شرع کی کیا شرم ہے۔ کڑی بات سہی نہ گئی۔ پاجی سے کوئی راضی نہیں۔

اس کے بعد مولانا نے بچوں کے لئے چار چار حروف جوڑ کر لفظ اور ان سے فقرے بنائے ہیں۔ ہر فقرے میں ان کے مخصوص انداز کی شوخی جھلکتی ہے:

جھوٹے پر خدا کی لعنت۔ پچھلی باتیں بھولو۔ لڑکا ہشیار معلوم ہوتا ہے۔ گلزار پر بہار ہے۔ اقرار کر کے انکار نہ چاہئے۔ یہ حکایت ہے کچھ شکایت نہیں۔ انسان اور حیوان میں عقل کا فرق ہے۔ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔ آدمی پانی کا بلبلا ہے۔ بے کار دل گھبراتا ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ جن دنوں آزاد یہ نصابی کتابیں لکھ رہے تھے، خود شاعر

ہونے کا باوجود انہیں بچوں کے لئے نظمیں لکھنے کا خیال تک نہیں آیا۔ اس وقت ہر طرف غزل کا زور تھا۔ گل و بلبل کے قصے تھے۔ یار و رخسار کی باتیں تھیں، ہجر کا رونا تھا اور وصال کی آرزو تھی۔ انگریزی تعلیم آجانے اور مثالیں سامنے ہونے کے باوجود ذہن غزل کے حصار سے نہیں نکل پا رہے تھے۔ شاید یہی سبب ہے کہ اردو کی ان ابتدائی کتابوں میں بچوں کی ایک بھی نظم نہیں۔ (اس کے پانچ سال بعد آزاد نے اُس وقت کے ناظم تعلیم کرنل ہالرائیڈ کو ایک ایسے مشاعرے کی ابتدا کرنے پر آمادہ کیا جس میں اردو شاعری سے مبالغہ آمیزی اور تصنع کے ختم کر کے حقیقت نگاری سے کام لیا جائے۔ چنانچہ ہر مہینے ہندوستان کے شاعروں کو مصرع طرح کے نیچرل مضامین دیئے جاتے تھے۔ اس پر روایت پسند شاعروں نے تلواریں سونت لیں مگر آزاد نے انہیں قائل کر کے چھوڑا)۔

قاعدہ کے بعد اردو کی پہلی کتاب میں آزاد نے وہ حکایتیں اپنے مخصوص انداز میں لکھی ہیں جنہیں عام طور پر نصیحت آموز کہا جاتا ہے۔ انہوں نے ہر حکایت کے آخر میں اس سے حاصل ہونے والی نصیحت نہیں لکھی ہے (جیسا کہ ڈپٹی نذیر احمد کچھ عرصے بعد کرنے والے ہیں) بلکہ حکایت سے جو بھی سبق ملتا ہے وہ پڑھنے والے کی سوچ سمجھ پر چھوڑ دیا ہے۔ ہر ہر فقرے سے آزاد کا اسلوب جھلکتا ہے۔ چند مثالیں:۔

ایک شخص نماز کے لئے گھر سے نکلے۔ مسجد دور تھی۔ رستے میں یاد آیا کہ چراغ گھر کا جلتا چھوڑ آیا ہوں۔ وہیں سے اُلٹا پھرا اور دروازے پر آ لونڈی سے پکار کر کہا کہ چراغ گل کر دینا اور دروازہ نہ کھولنا کہ گھسے گا۔ لونڈی نے کہا کہ میاں، میں نے تو چراغ پہلے ہی گل کر دیا تھا۔ تم ناحق اتنی راہ آئے اور گئے۔ تمہاری جوتی مفت گھِسی ہوگی۔ میاں نے کہا کہ اے دانا لونڈی، آفریں ہے تیری خیر خواہی اور دور اندیشی پر، مگر گھبرائیو نہیں کہ جوتی میں نے پہلے ہی بغل میں مالی ہے، ننگے پاؤں آیا ہوں۔

ایک برس مینہ نہ برسا۔ مکتب کا ملّا اپنے لڑکوں کو ساتھ لے کر شہر کے باہر دعا مانگنے چلا۔ ایک مسخرے نے رستے میں پوچھا کہ کہاں جاتے ہو؟ اُس نے کہا کہ مینہ نہیں برستا، بچے بے گناہ ہوتے ہیں، ان کی دعا خدا کی بارگاہ میں جلد قبول ہوگی، اس لئے انہیں لے چلا ہوں۔ مسخرے نے کہا کہ اگر لڑکوں کی دعا خدا کی بارگاہ میں جلد قبول ہوتی تو دنیا میں ایک ملّا بھی زندہ نہ رہتا۔

محمد حسین آزاد کی اردو کی یہ کتابیں پنجاب کے حکام کے کہنے پر پنجاب ہی میں لکھی گئی تھیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں ان کتابوں کا چلن عام ہوا یا نہیں۔ لیکن مجھے یہ معلوم ہے، بلکہ قدیم کتب خانوں سے نکال کر میں نے وہ کتابیں دیکھی ہیں جو یوپی اور دہلی میں لکھی جارہی تھیں۔ ان میں دو باتیں مشترک تھیں۔ ایک تو یہ کہ ان میں آزاد جیسی ایک بھی خوبی نہ تھی۔ دوسری یہ عجب بات تھی کہ وہ سب غیر مسلموں نے لکھی تھیں۔ اس طرح اردو سے ان کی وابستگی کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شمالی ہندوستان کے مدرسوں میں اُس وقت اردو کا رواج کس قدر عام تھا۔

طالب علموں کے لئے اُسی دور کی ایک کتاب ملی ہے جس کا نام سلکِ نصائح ہے اور جسے اردو مدرسہ میرٹھ کے استاد کلیان رائے نے ترتیب دیا تھا (۱۸۶۹ء)۔ سلکِ نصائح میں، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، نصیحتیں حروف تہجی کی لڑی میں پروئی گئی تھیں۔ مثال کے طور پر یہاں الف سے شروع ہونے والی کچھ نصیحتیں پڑھتے چلئے۔ ان سے اُس وقت کے ذہن اور اس کی تربیت کے اہتمام کا کچھ اندازہ ہوتا ہے:

الف

اپنے منہ سے اپنی تعریف کرنا بہت نازیبا ہے۔

انسان جیسا آپ ہوتا ہے ویسا ہی دوسروں کو خیال کرتا ہے۔

اکیلا رہنا عقل مند کا، بہتر ہے بد کی ہم نشینی سے۔

اگر فیاضی بے موقع کی جاوے تو بدی ہو جاتی ہے۔
احمق کی ایک بڑی پہچان یہ ہے کہ بے پوچھے بول اٹھتا ہے۔

کلیان رائے کی اس تصنیف کے ایک سال بعد ہمیں ایک دلچسپ کتاب ملتی ہے جس کا نام ہے مفید الاطفال۔ اس کے مصنف ماسٹر وزیر سنگھ ہیں جو مدرسہ سرکاری، دہلی کے مدرس تھے۔ ۱۸۷۰ء کی اس چھوٹی سی کتاب کے ذریعے انہوں نے کیا سکھایا، خود ان کی زبانی:

''رسالہ منظوم بطرز خالق باری، ہر شعر میں چار چار لفظ انگریزی، کُل پانسو۔ ہر انگریزی لفظ کے اوپر وہی لفظ بخط انگریزی بھی ہے''۔

آیئے آج اتنے عرصے بعد پڑھ کر دیکھیں:

ہے خدا گاڈ اور فضل گریس　　رحم مرسی ہے اور جائے پلیس
ماسک مسجد ہے اور گرجا چرچ　　فیتھ ایمان ہے تلاش ہے سرچ
پوجا ورشپ ہے فاسٹ ہے روزہ　　ساء ہے آرہ پلین ہے رندہ
کنٹری ملک، ورلڈ ہے دنیا　　چیسٹ صندوق کاسک ہے پیپا
ہے سٹی شہر اور قصبہ ٹاؤن　　شاہ ہے کنگ اور تاج کراؤن

اس کے بعد ۱۸۷۵ء کی ایک کتاب مفید الصبیان نظر آتی ہے یعنی لڑکوں کے فائدے کی کتاب۔ مصنف تھے رائے منشی درگا پرشاد، انسپکٹر مدارس، سرکل غربی، اودھ۔ اسے منشی نول کشور کے چھاپے خانے نے چھاپا تھا اور اس میں اردو یا انگریزی سکھانے کی بجائے سائنسی علوم کو موضوع بنایا گیا تھا۔ مثلاً ریل گاڑی کے بیان میں۔ ربر کے بیان میں۔ کانچ کے بیان میں۔ گھڑی کے بیان میں۔ روئی کے بیان میں۔ ہاتھی کے بیان میں اور گینڈے کے بیان میں۔

اس کتاب کو کہیں کہیں واقعات لکھ کر دلچسپ بنایا گیا ہے۔ ایک واقعہ یہاں لکھ دیا

جائے تو مصنف کے رویے کا بہتر اندازہ ہو سکے گا:

راجپوتنی کی جرات کے بیان میں:

نقل ہے کہ ایک عورت ملک راجپوتانہ کے کسی گاؤں میں رہتی تھی اور اس کے خاوند نے گاؤں کے قریب کھیتی کی تھی چنانچہ دن کو وہیں رہا کرتا تھا۔ ایک روز وہ عورت اپنے خاوند کے لئے روٹی لئے جاتی تھی کہ اتفاقاً راستے میں جنگل سے ایک ریچھ نکلا اور اس کی طرف بڑھ کر اس پر حملہ کیا۔ وہ عورت روٹی پھینک کر درخت کی آڑ میں چھپ گئی اور ریچھ اس کے پیچھے دوڑا۔ اُس نے درخت کے آس پاس گھومنا شروع کیا اور ریچھ بھی اس کے پیچھے رہا۔ آخر ریچھ نے اپنے دونوں ہاتھ درخت کے گرد، عورت کے پکڑنے کو پھیلائے۔ عورت نے یہ سمجھ کر کہ ریچھ کی گردن چھوٹی ہے اور میرے اور اس کے بیچ میں درخت حائل ہے، اس کے ہاتھ پکڑ لئے۔ ریچھ نے ہزار چاہا کہ اپنے ہاتھ چھڑا لے اور اسے کاٹے لیکن گردن کے چھوٹے ہونے سے کچھ نہ کر سکا۔ اس اثنا میں ایک سپاہی ادھر سے گزرا۔ اس عورت نے نہایت نرم آواز سے اسے پکارا کہ اے میاں سپاہی ذرا آ کر اس موذی کے ہاتھ تو پکڑ لو کہ میں اپنے میاں کو کھانا دے آؤں۔ سپاہی اس عورت کی نرم آواز سے سمجھا کہ یہ امر کچھ مشکل نہیں ہے اور اس نے ریچھ کے دونوں ہاتھ درخت کے اودھر سے پکڑ کے عورت سے کہا کہ ''لے اب تم جاؤ''۔

ابھی وہ کچھ دور نہ گئی تھی کہ سپاہی پکارا: ''صاحب۔ اِدھر آؤ۔ یہ کام تمہارا مجھ سے نہ ہوگا۔ اپنا خود کام تمام ہوتا ہے''۔

عورت نے کہا کہ میاں ذرا ٹھہر جاؤ۔ میں ابھی آتی ہوں۔ پس وہ اپنے خاوند پاس کھانا لے گئی اور اس سے یہ سارا ماجرا بیان کیا۔ اس کا خاوند کلہاڑی لے کر اس مقام پر آیا اور ریچھ کے سر پر ایک ضرب ایسی ماری کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا اور سپاہی کی جان بچی۔

طالب علموں کے لئے لکھی جانے والی انیسویں صدی کی کتابیں کھوجتے ہوئے اب ہم اور آگے چلتے ہیں اور ۱۸۷۸ء کی ایک کتاب ہمارے ہاتھ لگتی ہے جو منشی مول چند نے لکھی تھی اور امرتسر سے شائع ہوئی تھی۔ انہوں نے اس کتاب کا نام گلدستہ اردو رکھا تھا اور اس میں عام بول

چال کے محاورے اور کہاوتیں اکٹھا کی تھیں۔

بڑی عام سی غیر معیاری تحریر ہے اور بازاری فقرے لکھے گئے ہیں۔ گلدستہ اردو یقین ہے جلد ہی مرجھا گیا ہوگا۔ اب تو اس میں پانی دینے کی بھی خواہش نہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ درسی کتابوں پر کڑا وقت پڑا تھا۔ کچھ ایسے ہی قاعدے اور نصیحت آموز کتابیں گردش کر رہی تھیں جن کو معیاری کہنے میں اب اس صدی میں اک ذرا دشواری ہوتی ہے۔ شاید ۱۸۵۷ء کی بغاوت اور اس سے بھی بڑھ کر اس کے انتقام نے کچھ ایسی کیفیت پیدا کی کہ کسی معقول شخصیت کی طبیعت ادھر نہیں جا رہی تھی۔ اسماعیل میرٹھی ابھی تک قوم کو فارسی پڑھا رہے تھے جب کہ روزمرہ زندگی میں فارسی کے عمل دخل کا چل چلاؤ صاف نظر آ رہا تھا۔

بامقصد اور قرینے کی کتابوں کا نہ ہونا سب سے پہلے ہمارے ڈپٹی نذیر احمد پر شاق گزرا۔ وہ بھی یوں کہ وہ تقریباً پچاس برس کے سن میں ریاست حیدرآباد کی اعلیٰ ملازمتوں سے استعفادے کر دِتی آئے اور گھر میں بیٹھ رہے۔ ان کے بہت سے بچے ہوئے لیکن صرف دو بیٹیاں سکینہ اور صغریٰ اور ایک بیٹا بشیر زندہ رہے۔ گھر میں رہ کر انہوں نے بچوں کی تعلیم کی طرف دھیان دیا تو ملک میں رائج درسی کتابوں کا حال اچھا نہ تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ اپنے بچوں کو کیا پڑھائیں۔ مگر ان جیسی ذہنی اپج اور صناعی کس کو نصیب ہوئی ہوگی۔ انہوں نے یہ مسئلہ خود حل کرنے کی ٹھانی اور اپنے ایک لیکچر میں بتایا:

''میں اپنے بچوں کے لئے ایسی کتابیں چاہتا تھا کہ وہ ان کو چاؤ سے پڑھیں۔ ڈھونڈا، تلاش کیا، کہیں پتہ نہ لگا (یہ بات ۱۸۶۸ء کے قریب کی ہے، آزاد اس وقت لاہور میں اپنی اردو ریڈر لکھنے کا قصد کر رہے ہوں گے)۔ ناچار میں نے ہر ایک کے مناسب حال کتابیں بنانی شروع کیں۔ بڑی لڑکی کے لئے مراۃ العروس، چھوٹی کے لئے منتخب الحکایات، اور بشیر کے لئے چند پند۔ یہ نہیں کہ کتابیں سالم لکھ لیں تب پڑھانی شروع کیں۔ نہیں، بلکہ ہر ایک کتاب کے چار پانچ صفحے لکھ کر ہر ایک کے حوالے کر دیئے۔ مگر وہ بچوں کو ایسی بھائیں کہ جس کو پاؤ صفحے پڑھنے کی طاقت تھی وہ آدھے صفحے کے لئے اور جس کو ایک صفحے کی استعداد تھی وہ ورق کے لئے متعجل تھا۔

جب دیکھو ایک نہ ایک متقاضی ہوتا کہ میرا سبق کم رہ گیا ہے۔ میں اسی وقت قلم برداشتہ لکھ دیا کرتا۔ یوں کتابوں کا پہلا گھان تیار ہوا۔"

کتابیں مکمل کرنے کے بعد ڈپٹی صاحب کو احساس ہوا کہ نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کے لئے خاصے کی چیز بن گئی ہے۔ یہ سارے مسودے اٹھا کر ناظم تعلیم ایم کیمپسن کے پاس پہنچے۔ وہ مسودے پڑھ کر اتنے خوش ہوئے کہ فوراً یہ کتابیں تعلیمی نصاب میں شامل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ صرف یہی نہیں، ۱۸۶۹ء کے آگرہ دربار میں انہیں حکومت کی طرف سے ایک ہزار روپے دیئے گئے اور قدر دانی کے اعتراف کے طور پر سرکار نے مراۃ العروس کی دو ہزار جلدیں بھی خریدیں۔

تینوں بچوں کے لئے ان کی یہ کتابیں اس وقت تک تیار ہو چکی تھیں۔ میرے سامنے چھوٹی بیٹی کے لئے لکھی جانے والی 'منتخب الحکایات' ہے جو الہ آباد میں شائع ہوئی اور اس پر تاریخ ۱۸۸۹ء درج ہے۔

مراۃ العروس کو طویل عمر ملی، اب بھی دستیاب ہے لیکن منتخب الحکایات آگے چل کر محو ہوگئی۔ اس میں ڈپٹی صاحب نے، خود ان کے بقول، حکیم لقمان کی ۷۷ حکایتیں لکھی ہیں مگر ان حکایتوں میں جو شگفتہ، شائستہ، دل کو لبھانے والا اور بچوں کو بھانے والا، بقول شخصے ان کا جو ظریفانہ رنگ نظر آتا ہے وہ خود حکیم لقمان کے حصے میں بھی نہ آیا ہوگا۔

میں نے ظالم بھیڑیا کے نام سے ان کا انتخاب لاہور سے شائع کرایا ہے، یہ الگ بات ہے کہ آج کے والدین اور خود طالب علم اس طرف ذرا کم ہی مائل ہیں۔ اس پوری کتاب کی نمایندہ حکایت یہاں نقل کردی جائے تو نذیر احمد کے مخصوص اسلوب کے بارے میں میری بات کی تصدیق ہو جائے گی۔ وہ حکایت یوں ہے:

"ایک بھیڑیا کسی ندی میں پانی پی رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ہزار قدم کے فاصلے پر ندی کے بہاؤ کی طرف ایک بکری کا بچہ بھی پانی پی رہا ہے۔ بکری کے بچے کو دیکھ کر بھیڑیے کا جی للچایا اور اس بات پر آمادہ ہوا کہ کوئی الزام لگا کر اس کو مارے۔ یہ سوچ کر بکری کے بچے کے پاس جا کر کہنے لگا: کیوں بے، بے تمیز، تو نے ندی کے پانی کو گدلا کر کے آخر ہم کو پیاسا مارا۔ بکری کا بچہ بھیڑیے کی

ہیبت ناک صورت دیکھ، اور اس کی گھڑی کی سن کا کانپنے لگا اور گڑگڑا کر عرض کیا کہ جناب، اتنی بڑی تو ندی کہ اِس پار سے اُس پار کا آدمی نظر نہیں آتا، دوسرے آپ ہزار قدم چڑھاؤ کی طرف پانی پیتے تھے۔ مجھ شامت زدہ نے ایک چلّو پانی یہاں سے بے خبری کی حالت میں اگر پی بھی لیا تو اس سے تمام ندی کا پانی گدلا نہیں ہو سکتا۔ بھیڑیے نے یہ بات سن کر کہا کہ ہاں میں جانتا ہوں تو منطق پڑھا ہوا ہے۔ تمہاری ذات بڑی حجتی ہے۔ تم ہر بات میں پہلو سوچا کرتے ہو۔ تم بھیڑیوں ہی پر نہیں، بلکہ جنگل کے تمام جانوروں پر بڑا ظلم کرتے ہو اور جب تم کو کوئی معقول کرنا چاہے تو تم پیچ دار باتوں سے الٹا اسی کو خطاوار ٹھہراتے ہو۔ اسی طرح تیرے باپ نے اس جنگل کے بھیڑیوں کا دم ناک میں کر رکھا تھا۔ آخر کو میں نے مجبور ہو کر اس کو مارا اور خدا خدا کر کے اس کے عذاب سے نجات پائی۔ کیا تجھ کو یاد نہیں اور تو نہیں جانتا اور پھر بھی تو باز نہ رہا۔ بکری کے بچے نے عرض کیا کہ جناب، میرا باپ تو کسی بھیڑیے کے ہاتھ ہلاک نہیں ہوا بلکہ ہمارے مالک کے گھر بیٹا پیدا ہوا تھا (خدا کرے جیتا رہے) اُس کے عقیقے میں میرا باپ قربان ہو کر حقِ نمک سے ادا ہوا۔ بھیڑیے نے کہا، ہاں تو بڑا حاضر جواب ہے اور کسی سے قائل ہونے والا نہیں۔ لیکن جو سنے گا بخوبی سمجھ لے گا کہ تو نے آج ایسا بڑا بھاری قصور کیا ہے جس کے عوض تجھ کو مار ڈالنے کے سوائے کوئی چارہ نہیں۔ اس سے زیادہ بحث کرنے کی مجھ کو ضرورت نہیں۔ یہ کہہ کر بے رحم بھیڑیے نے بے گناہ اور معصوم بکری کے بچے کو پھاڑ ڈالا۔

حاصل: ظالم جب ظلم کرنے پر آمادہ ہوتا ہے تو کوئی ثبوت اور کوئی عذر اس کے ہاتھوں سے پناہ نہیں دے سکتا۔"

اس حکایت میں کیا مبینہ غدر اور اس کے انتقام کی طرف اشارہ نہیں ہے؟ یا یہ میرا محض گمان ہے۔ بہر حال، منتخب الحکایات اس طرح کی ریڈر نہیں تھی جیسی پنجاب میں محمد حسین آزاد نے لکھی تھی اور جیسی آگرہ میں اسماعیل مرٹھی لکھنے والے تھے۔ اُن دونوں کی کتابوں نے اردو زبان اور ہندوستانی اخلاقیات کی تدریس کے نئے باب وا کر دیئے اور پھر یہ سلسلہ آگے تک چلتا رہا۔ مولانا آزاد اور نذیر احمد کے ہم مکتب مولوی ذکا اللہ نے بھی سرکاری اسکولوں کے لئے اردو

ریڈروں کا سلسلہ مرتب کیا تھا۔ ان میں اسماعیل میرٹھی کی نظمیں شامل تھیں۔ پھر کسی مرحلے پر انجمن حمایت اسلام، لاہور نے ایک پورا سلسلہ ترتیب دیا جو صرف مسلمان طالب علموں کی خاطر لکھا گیا تھا۔ اس میں بھی اسماعیل میرٹھی جا بجا نظر آئے۔ لیکن یہ اردو ریڈرس جلد ہی وقت کے غبار میں دھندلا گئیں یہاں تک کہ ۱۹۴۰ء کے قریب مولوی شیخ محمد چاند صاحب کا بولتا قاعدہ نمودار ہوا۔ اس دیئے میں تیل تھا، اب تک روشنی دے رہا ہے۔

مجھے ایک اور قاعدہ یاد ہے جو بن کھلے مرجھا گیا۔ سنہ ۸۲ء میں جب میرا رام پور جانا ہوا اور اکبر علی خاں عرشی زادہ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بھارت میں اردو کی ترویج کے لئے اپنی ایک تجویز بیان کی۔ کہنے لگے کہ اسکولوں میں تو اب ہمارے بچوں کو ہندی پڑھائی جا رہی ہے اور اردو سے ان کا تعلق ختم ہی سمجھئے۔ بس ایک بات جو آس بندھاتی ہے وہ یہ کہ ہمارے اکثر بچوں کو قرآن اب بھی پڑھایا جاتا ہے۔ تو جب وہ عربی حروف تہجی سیکھ رہے ہیں تو اس کے ساتھ ساتھ فارسی اور ہندی کے دس بارہ حروف بھی سکھا دیئے جائیں تو وہ اردو باآسانی سیکھ جائیں گے۔ اس سلسلے میں عرشی زادہ مرحوم نے بچوں کو قرآن پڑھانے والے مولوی حضرات سے بات کی اور کہا کہ آپ بچوں کو قرآن کے ساتھ اردو نہیں پڑھائیں گے تو آپ کے تراجم، تفاسیر، سیرت اور تاریخ کی نادر کتابیں الماریوں میں دھری رہ جائیں گی کیونکہ پھر ان کا پڑھنے والا کوئی نہ ہوگا لہٰذا بچوں کو قرآن کے ساتھ یہ چند حروف اور سکھا دیجئے، انہیں اردو خود بخود آ جائے گی۔

وہ کہتے تھے کہ یہ بات مولوی حضرات کی سمجھ میں آ گئی۔ انہوں نے اتفاق بھی کر لیا اور عرشی زادہ نے بطور خاص اپنی تجویز کو سامنے رکھ کر ایک بہت چھوٹا سا قاعدہ ترتیب دیا جس کا ایک نسخہ مرحوم نے مجھے بھی دیا۔ وہ کہیں گم ہو گیا لیکن مجھے اتنا یاد ہے کہ اس میں ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور اس میں انہوں نے جدید اسلوب اختیار کر کے اسے دلچسپ بنا دیا تھا۔

مگر معلوم ہوتا ہے کہ وہ چھوٹا سا قاعدہ اور وہ بڑی سی تجویز کسی گوشہ گم نامی میں آج تک سر نیوڑھائے پڑی ہے۔ پھر کسی کو خیال نہیں آیا کہ اتنے اعلیٰ مقصد کو آگے بڑھایا جائے اور اگر خیال آیا بھی ہوگا تو کسی کو کیا پڑی ہے کہ کسی دوسرے کا کام مکمل اور نام اونچا کرے۔

یہاں تو ہر ایک اپنی نبیڑ رہا ہے۔

اب جو ہم جدید زمانے کی طرف آتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اکیسویں صدی کے بچوں کو اردو کس ڈھب سے پڑھائی جارہی ہے تو ہمارے سامنے موازنے کے لئے دو مثالیں ہیں۔ اول ہندوستان کی نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ جس نے پہلی جماعت سے بارہویں جماعت تک کے طالب علموں کے لئے درسی کتابوں کا پورا سلسلہ مرتب کیا ہے۔ یہ کتابیں سرکردہ اور ممتاز دانش وروں اور ماہر اساتذہ کی اردو کمیٹی نے ترتیب دی ہیں جس کے سربراہ پروفیسر گوپی چند نارنگ ہیں۔

زمانہ بدل گیا ہے، چنانچہ پہلی کتاب بہت صاف اور سلجھی ہوئی ہے اور بغدادی قاعدے کی طرح حرف پر حرف سوار نہیں۔ اس میں بچوں کو الف بے پے میں نہیں الجھایا گیا ہے اور پہلا سبق ان کے سامنے صرف ایک لفظ 'آم' کھولتا ہے۔ بعد میں اس کے ساتھ لگے لگے تین لفظ 'دادا۔ دادی۔ دو' ہیں اور بس۔ یہ سبق مکمل ہوا۔

دوسرا سبق دو لفظوں 'دس۔ رس' کا ہے، جس کے ساتھ چار ذیلی لفظ 'دام۔ رام۔ دارا۔ دے' سکھائے گئے ہیں۔ اب تک سارے حرف الگ الگ ہیں، کہیں کوئی جوڑ نہیں۔

تیسرے سبق میں لفظ 'لال' سکھایا گیا ہے اور یہاں لام اور الف کو جوڑا گیا ہے۔

یہ سلسلہ دھیرے دھیرے آگے بڑھتا ہے۔ کسی سبق میں چار سے زیادہ لفظ متعارف نہیں کرائے گئے ہیں۔ ساتویں سبق میں پہلی بار مکمل جملہ بنا ہے: 'درزی آیا۔ کپڑے سی کر لایا'۔ دسویں سبق میں چار لفظوں کو جملہ بنایا گیا ہے: 'سورج ڈوبا رات ہوئی'۔ گیارہویں سبق کا عنوان ہے: میلے کی سیر اور اس میں ہر سبق کی طرح خوش رنگ تصویر کے ساتھ پورا مضمون باندھا گیا ہے۔ ۱۴ ویں سبق میں کہیں جا کر ب پ ت ٹ ث اور اسی طرح ج چ ح خ، کنبوں میں بانٹ کر پڑھائے گئے ہیں۔ بس اس کے بعد عبارت رواں ہو جاتی ہے اور کتاب پہیلیوں پر ختم ہوتی ہے:

ہری تھی من بھری تھی	لاکھ موتی جڑی تھی
راجا جی کے باغ میں	دوشالا اوڑھے کھڑی تھی

اور آخر میں ہم آتے ہیں پاکستان کے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور کی طرف جس کی کتابیں پڑھانے کا ہر مدرسہ پابند ہے لہٰذا میرے سامنے پہلی جماعت کا جو قاعدہ ہے اس کی اسی ہزار جلدیں چھپی تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کتاب چند بچوں کے لئے نہیں، ایک پوری نسل کے لئے لکھوائی گئی ہے اور دعویٰ ہے کہ ماہروں نے لکھی، ماہروں نے معائنہ کیا اور ماہروں نے منظوری دی۔

بیشتر قاعدوں کی طرح یہ قاعدہ بھی الف بے پے تے سے شروع ہوتا ہے۔ مثلاً جہاں پ سے تصویر کی شکل میں پنکھا، پنسل اور پاؤں دکھایا گیا ہے وہیں لکھے ہوئے الفاظ میں پا۔ آپا۔ آپ آ۔ آپ اور باپ جیسے پانچ چھ لفظ بھی سکھائے گئے ہیں۔ یہ سلسلہ آخر تک چلتا ہے لیکن جس ماہر نے بھی یہ قاعدہ ترتیب دیا ہے اس کی سب سے بڑی تمنا یہ معلوم ہوتی ہے کہ ۳۲ صفحوں کے اس ایک قاعدے میں بچے کو قریب قریب ساری اردو پڑھا کر لائق و فائق کر دیا جائے، کیونکہ ذرا آگے چل کر ہر سبق میں لفظوں کا جو سیلاب آتا ہے اور الفاظ کی جس طرح بھرمار کی گئی ہے اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ہر حرف کے ساتھ لفظوں کی فوج کھڑی کر دی گئی ہے جیسے بچے کو لفظ سکھانے کا بس یہی ایک موقع ہے۔

بلا شبہ رنگین تصویریں بنوائی گئی ہیں مگر ایک ایک صفحے پر شروع میں چالیس چالیس الفاظ سکھانے کی سعی کی گئی ہے اور آگے چل کر یہ تعداد پچاس الفاظ فی صفحہ تک پہنچ جاتی ہے۔ کئی جگہ تو غریب کاتب چھوٹے چھوٹے چوکھنوں میں پچیس پچیس لفظ کھپاتے کھپاتے ہانپ گیا ہے۔ لفظوں کا ایک ایسا طومار ہے کہ درد آنکھوں کے راستے پہلے سر تک پہنچتا ہے اور پھر دل میں اترنے لگتا ہے اور کتاب کے مشہور اور سر کردہ مصنفوں سے زیادہ جماعت کے اس چھوٹے سے بچے کی طرف دھیان جاتا ہے جس بچارے کے ننھے سے ذہن کا ذرا سا بھی خیال نہیں رکھا گیا ہے۔

اس قاعدے کا باقاعدہ مطالعہ کر کے میں سو گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس کے سارے مصنف، اس کے تمام معائنہ کار اور اسے منظوری دینے والے افراد، سب کے سب ایک ساتھ بول رہے ہیں، اور قریب ہی بہت سے خاموش بچے دوشالہ اوڑھے کھڑے ہیں۔

سوچتا ہوں شاید کوئی اس خواب کی تعبیر بتا دے۔

کمپیوٹر آمد، کتابت برخاست

مجھے وہ دن ہمیشہ یاد رہے گا جب کراچی سے تیز گام کی ایک بوگی میں بھر کر اخباری کارکنوں کا قافلہ روزنامہ جنگ نکالنے کے لئے راولپنڈی کی طرف روانہ ہوا تھا۔ ۱۹۵۹ء اپنے خاتمے کے قریب تھا اور راولپنڈی میں سردی زوروں پر تھی لہٰذا یہ کارواں گرم کپڑوں سے لدا پھندا تھا اور ہر طرح کے بستر بندوں، ٹرنکوں، پیٹیوں، سوٹ کیسوں، رسی میں بندھی ہوئی دریوں اور تکیوں اور کھانے سے بھرے ہوئے ناشتے دانوں سے پوری طرح آراستہ تھا۔

ریل کے اس ڈبے میں ادارتی عملے کا صرف ایک شخص تھا اور وہ بھی نو آموز سا جونیئر سب ایڈیٹر رضا علی، دو تین دوسرے محنت کش تھے باقی سارے کے سارے کاتب تھے۔ چالیس نہیں تو پانچ کم چالیس ضرور ہوں گے۔ راولپنڈی سے اردو روزنامہ نکالنے کے لئے یوں تو خود راولپنڈی میں مقامی کاتب بھرتی کئے جاسکتے تھے لیکن اتنے سارے کاتب کراچی سے لے جانے کا ایک مقصد بھی تھا، اور وہ یہ کہ پنجاب کے کاتبوں کا خط لاہوری تھا اور روزنامہ جنگ اپنے دلی کے خط کی وجہ سے مشہور بھی تھا اور یہی اس کی پہچان بھی تھی۔ اب تک یہ اخبار ہوائی جہاز کے

ذریعے جایا کرتا تھا لیکن اب جب کہ ملک کا دارالحکومت راولپنڈی کے نواح میں بننا قرار پا رہا تھا، وہاں سے روزنامے کی اشاعت شروع کر دینا ہی کافی نہ تھا بلکہ ضروری تھا کہ اس کی شکل و شباہت بھی ویسی ہی ہو جیسی کراچی ایڈیشن کی تھی۔ وہی بات کہ اخبار کا دہلوی خط برقرار رکھنا ضروری تھا۔

چنانچہ دتی کی بولی بولتا ہوا یہ قافلہ اُس رات پوٹھوہاری سرزمین پر اس شان سے وارد ہوا کہ کڑاکے کا جاڑا تھا اور آسمان سے دھند اتر رہی تھی۔ یہ وہ دن تھے کہ صبح جس وقت بچے اسکول کی بسوں میں چڑھا کرتے تھے، پنڈی کا درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے نیچے اتر جایا کرتا تھا۔ کراچی کے باشندے برسوں میں ایک آدھ بار چنے برابر اولے گرنے کے منظر سے تو واقف تھے مگر یہ غضب کا جاڑا اگر ان کی انگلیوں کو یخ کر دیتا تو کتابت کا کوئی متبادل ذریعہ فراہم کرنے کے لئے کاتب تقدیر سے گڑگڑا کر استدعا کرنا پڑتی۔ (دتی کی بولی میں: کرنی پڑتی)

راولپنڈی کے علاقے صدر میں اُس وقت کی ایڈورڈز روڈ پر کیفے کامران کی اوپر کی منزل میں جنگ کا دفتر قائم کیا گیا جس میں ادارتی عملے کے لئے ایک معقول کمرے کا لیکن کئی درجن کاتبوں کے لئے ایک کشادہ برآمدے کا انتظام کیا گیا جسے گرم رکھنے کا وافر بندوبست بھی تھا اور کاتبوں کی آنکھوں کی خیر، اس خیال سے تیز روشنی کا اہتمام بھی تھا۔ یہ کاتب دیوار سے ٹیک لگا کر اور گھٹنے پر کاغذ رکھ کر کتابت کرتے تھے اور بلاشبہ صاحب کمال تھے۔

ان کا پہلا کمال یہ تھا کہ ادارتی عملے کی بدخطی کے خوب شناسا تھے۔ تھوڑا سا عملہ ہوتا تھا جسے اخبار کے آٹھ دس صفحے بھرنے ہوتے تھے اس لئے لوگ بہت تیزی سے لکھتے تھے اور انہیں یہ اطمینان تھا کہ کاتبوں کی یہ فوج ظفر موج یہ مطالبہ نہیں کرے گی کہ عیسیٰ کے لکھے کو پڑھنے کے لئے اب کہیں سے موسیٰ کو لایا جائے۔

کاتبوں کا دوسرا کمال یہ تھا کہ دن دیکھتے تھے نہ رات، موقع کا خیال ہوتا تھا نہ محل کا، بس بیمار ہو جاتے تھے۔ یہ روز کا معمول تھا کہ کم سے کم تین چار کاتب غیر حاضر رہا کرتے تھے۔

یہ ایک مخصوص ہنر سے جڑا ہوا ایک پیشہ تھا، کوئی مزدوری نہ تھی کہ دس مزدور علیل ہو گئے تو کسی کو دوڑا کر بازار سے دس اور مزدور بلا لئے۔ مالکان اخبار پر لازم تھا کہ اپنے عملے ہی سے کام

چلائیں۔ پھر یہ بھی ممکن نہ تھا کہ دہلوی خط والے کاتبوں کے بیچ میں لاہوری خط والے عارضی کاتبوں کو بٹھا کر کام نکال لیا جائے۔ اس کا علاج یہ تھا کہ جہاں تیس کاتبوں سے گزارا ہو جائے وہاں چالیس بھرتی کئے جائیں۔ یوں نہ ہو تو اس تیز گام کا چلنا مشکل ہو جائے۔ چنانچہ کاتبوں کے عملے نے، جو فوج کم اور ظفر موج زیادہ تھی، راتوں کو جاگ جاگ کر اخبار کی کتابت شروع کی۔ وہ مفلسی کے دن تھے اور اخبار کے مالکوں اور عملے کے افراد کے لئے ممکن نہ تھا کہ اپنی سواریوں کا بندوبست کر کے رات دو ڈھائی بجے گھروں کو جائیں۔ آخری کاپی پریس بھیج کر یہ لمبا چوڑا قافلہ دفتر سے باہر نکلتا اور گھروں کی طرف پیدل چل پڑتا۔

صدر کے کتوں اور پولیس والوں نے یہ منظر پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ دونوں ہی قافلے کی راہ روکتے اور اپنے اپنے انداز میں پوچھ گچھ کرتے۔ پولیس والے تو کچھ عرصے میں عادی ہو گئے لیکن کتے برسہا برس بھونکتے رہے اور ان کے بارے میں یقین ہے کہ ان کی اولادیں آج بھی راتوں کو با آواز بلند نہیں تو دل ہی دل میں ضرور بھونکتی ہوں گی۔

مگر میرا موضوع نئے دارالحکومت کی تعمیر سے پہلے ہی نئے اخبار کی اشاعت نہیں۔ میرا موضوع یہ ہے کہ اردو اخبار، رسالے، کتاب اور جریدے کی اشاعت میں کاتب کا کیا عمل تھا اور اس سے بھی بڑھ کر کیا دخل تھا۔ یقین ہے کہ یہاں پہنچتے پہنچتے قارئین کو صورت حال کا تھوڑا، اور ممکن ہے، بہت اندازہ ہو گیا ہوگا۔

سچ تو یہ ہے کہ خطاطی کو اردو رسم الخط اور نستعلیق کے تاج میں کسی بھی پرندے کا پر کہا جائے، یہ کتابت اردو کی ترقی کی راہ میں دیوار بن کر کھڑی تھی۔ کاتب کے بغیر اردو کا ہر کام بند تھا۔ اردو کی پیش رفت کاتب کی مرہون منت تھی۔ سارا روزگار اس ایک پیشے سے یوں بندھا ہوا تھا جیسے اسکول میں دو دو بچوں کی ایک ایک ٹانگ ایک دوسرے سے باندھ کر تین ٹانگوں کی دوڑ کرائی جاتی تھی۔

شروع شروع میں لوگ کہتے تھے، بعد میں کہنا بھی چھوڑ دیا کہ اردو کو کاتب سے جس قدر جلد نجات ملے، اچھا ہو۔ کیوں نہ یہاں شروع شروع کی کہانی بیان کر دی جائے۔

ہندوستان میں جب تک چھاپہ خانہ نہیں آیا، تمام کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں۔ جن لوگوں کا پیشہ خوش نویسی تھا وہ گھروں میں بیٹھ کر اُس دور کی کتابوں کی نقل کیا کرتے تھے اور بازار میں لے جاکر فروخت کیا کرتے تھے۔ برٹش لائبریری میں 'حالِ جنگ کابل' کا جو مخطوطہ رکھا ہے، ایسا ہی کوئی خوش نویس لکھ کر بازار میں لایا ہوگا۔ جب کسی انگریز نے اسے خریدنے کی خواہش ظاہر کی تو کاتب نے کسی طرح سے کتاب پر لکھی ہوئی پہلی قیمت مٹا کر اسے 'آٹھ آنہ' بنایا۔ سچ تو یہ ہے کہ چھاپہ خانہ آجانے کے بعد بھی عرصے تک کتابیں ہاتھ سے نقل کر کے فروخت کرنے کا سلسلہ چلا۔

اس کا دلچسپ منظر میں نے ۱۹۸۲ء میں پٹنہ کی خدابخش لائبریری میں دیکھا جس کے نگراں اس وقت عابد رضا بیدار تھے اور انہوں نے دنیا کو دکھا دیا تھا کہ زندہ اور جیتا جاگتا کتب خانہ کیسا ہوتا ہے۔

اس لائبریری میں جو لوگ ہاتھ کے لکھے ہوئے پرانے نسخوں کی نقل حاصل کرنا چاہتے تھے ان کے لئے جدید مشینوں پر فوٹو کاپی یا زیروکس کاپی نہیں بنائی جاتی تھی بلکہ لائبریری میں خوش نویس بیٹھا کرتے تھے جو پرانے نسخوں کی نقل کیا کرتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ نقل کے لئے کہیں سے کاغذ بھی اسی پرانی وضع کا حاصل کیا جاتا تھا یہاں تک کہ نقل پر اصل کا گمان ہونے لگا تھا۔

اسی شہر پٹنہ میں مجھ سے تقریباً ایک سو برس پہلے چارلس ولکنس (وفات ۱۸۳۶) بھی آئے تھے جنہیں اردو چھاپے خانے کا باوا آدم کہا جا سکتا ہے۔ انگلستان سے ہندوستان پہنچ کر اور کلکتے میں رہ کر انہوں نے مقامی بولیوں میں مہارت حاصل کرلی تھی۔ پٹنہ میں انہیں سکھوں کے کالج میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں انہوں نے غالباً پہلی بار لوگوں کو پنجابی بولتے سنا اور لکھا کہ ان کی بولی میں فارسی، عربی اور کچھ سنسکرت کی آمیزش ہے اور ان کا لہجہ 'ہندوی' سے ملتا جلتا ہے۔

اُس وقت اردو کا یہی نام تھا۔ خود انگریز ہماری زبان کو ہندوستانی کہنے لگے تھے اور اب تک کہتے ہیں۔ چارلس ولکنس ایسٹ انڈیا کمپنی کے پہلے لائبریرین کی حیثیت سے ولایت سے بنگالہ گئے تھے۔ یہ تو معلوم نہیں کہ کتنے پڑھے لکھے تھے لیکن زبانیں سیکھنے کا غیر معمولی ہنر آتا

تھا۔ دیکھتے دیکھتے انہوں نے بنگالی، فارسی اور عربی سیکھ لی اور سنسکرت سے تو ایسا عشق اختیار کیا کہ بابائے سنسکرت کہلائے جانے لگے۔ ولکنس کو دوسرا فن ٹائپ کے حروف ڈھالنے کا آتا تھا۔ اس زمانے میں چھاپے کا دوسرا نام ٹائپ ہی تھا۔ اس وقت طباعت کا کوئی دوسرا تصور ہی نہ تھا۔ کتابت کرکے کتاب چھاپنے کا کسی کو خیال تک بھی نہ آیا تھا۔ چنانچہ ولکنس نے ایک ہندوستانی وہار پنچانن کو ساتھ ملایا اور بنگالی کا ٹائپ ڈھال کر ہگلی کے ایک کتب فروش کے چھاپے خانے میں بنگالی کی پہلی قواعد بھی چھاپ دی۔ یہ بات ۱۷۷۸ء کی ہے۔ یہ کامیابی دیکھ کر لارڈ ہیسٹنگز کی حکومت نے سرکاری چھاپہ خانہ قائم کرنے کی منظوری دے دی۔ انگریزی اور بنگالی ٹائپ تو بن چکا تھا۔ اب فارسی کی باری تھی۔

اس وقت ہندوستان میں ساری سرکاری کارروائی فارسی میں ہوتی تھی۔ لوگ بولتے اردو تھے، شعر اردو میں موزوں کرتے تھے لیکن لکھتے فارسی تھے۔ نجی خطوط اور پوسٹ کارڈ تک فارسی میں لکھے جاتے تھے۔ درخواستیں، عرضیاں، عذرداریاں، سب کی سب فارسی میں ہوا کرتی تھیں۔ اب جو ولکنس نے فارسی ٹائپ تیار کیا تو ساری سرکاری دستاویزیں اور قواعد وضوابط فارسی میں طبع ہونے لگے۔ پھر کلکتے میں پہلی ادبی کتاب چھپی جو نستعلیق ٹائپ میں کمپوز کی گئی۔ یہ فرانسس بالفور کی The Form of Haerkeru تھی۔ اس میں ہر قسم کی کاروباری دستاویزات اور خط و کتابت کے نمونے جمع کر دیئے گئے تھے۔ اسی کو ایک لحاظ سے برصغیر میں اردو طباعت کی ابتدا کہا جاسکتا ہے۔

خود ولکنس نستعلیق حروف کو جوڑ کر لفظ بنانے کے کام سے مطمئن نہیں تھے اور اس ٹائپ کی شکل وشباہت سے بھی ناخوش تھے لیکن بعد میں جان گلکرسٹ نے اسے 'نفیس' قرار دیا اور اسی کو عزیز بنا کر رکھا کہ جب ۱۸۰۳ء کے لگ بھگ اردو کی کتابیں چھپنی شروع ہوئیں تو ساری کی ساری اسی ٹائپ میں چھپیں۔ میر امن کی باغ و بہار سے لے کر میر تقی میر کی کلیات جیسی ضخیم کتاب تک ان ہی نستعلیق حروف میں شائع ہوئی۔

ان زبانوں کی کمپوزنگ کے لئے کلکتہ کے سرکاری چھاپے خانے میں ایک پنڈت،

ایک منشی اور ان کے سولہ مددگار رکھے گئے۔ اس دور کی ساری کی ساری کتابیں بے حد احتیاط سے محفوظ ہیں جنہیں دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ وہ ٹائپ کیسے بنایا گیا ہوگا، اس کی کمپوزنگ کیونکر ہوتی ہوگی، ان کے فرموں کو کیسے سنبھالتے اور سمیٹے رکھتے ہوں گے کہ جس میں حروف برابر برابر نہیں بیٹھتے بلکہ ایک دوسرے کے اوپر چڑھتے بھی ہیں۔

ولکنس صاحب کی یہ ایجاد اردو طباعت پر کتنا ہی بڑا احسان سہی، اس نستعلیق ٹائپ کی قسمت میں طویل عمر نہیں لکھی تھی۔

آخر وہ دن آ پہنچا جس نے کاتب نامی مخلوق کو جنم دیا۔ ہوا یہ کہ نقشے اور اشکال چھاپنے کے لئے وہ چھاپہ خانہ رواج پا گیا جسے لیتھو کہا جاتا تھا۔ اس میں ٹائپ کو دخل نہیں تھا بلکہ پتھر کی سلوں پر نقشوں وغیرہ کا چربہ اتار کر اور اس پر بیلن سے سیاہی پھیر کر سینکڑوں نقلیں اتار لی جاتی تھیں۔ اس وقت ہندوستانیوں کی ایجاد کی رگ پھڑکی اور کسی کو خیال آیا کہ کیوں نہ نقشوں کی جگہ خوش نویسی کے چربے اتارے جائیں۔ تجربہ کامیاب رہا۔ اردو، فارسی اور عربی کتابوں کی کتابت چھاپے خانے کے راستے کتابوں میں ڈھلنے لگی اور ہماری ساری طباعت ٹائپ کے آہنی جنگلے سے رہائی پا کر لیتھو کے سنگلاخ میدانوں میں قلانچیں بھرنے لگی۔

دیکھا دیکھی وقت نے بھی قلانچیں بھریں۔ پتھر کی سلیں رخصت ہوئیں۔ ان کی جگہ جستے کے پلیٹیں آ گئیں۔ چھاپہ خانے نے زیادہ تیزی پکڑی تو یہی پلیٹیں روٹری مشینوں پر چڑھ کر لاکھوں کی تعداد میں اخبار اور کتابیں چھاپنے لگیں۔

سب کچھ ہوا، کتابت نے اردو کا دامن نہ چھوڑا۔

جب تک لیتھو کی چھپائی چلی، اس کے پہلو سے لگی لگی وہ تحریک بھی چلی جس کا مقصد تھا کہ اردو میں ایران اور عرب دنیا کی طرح نسخ ٹائپ کو رواج دیا جائے۔ سارا مشرق وسطیٰ لیتھو کی چھپائی کے چنگل سے آزادی پا چکا تھا۔ عالمِ عرب میں تو نسخ ٹائپ باآسانی رائج ہو گیا کیونکہ اس کی لکھائی عربی حروف کی شکل میں تھی۔ اہل ایران نے کمال کیا اور اپنی قدیم نستعلیق چھوڑ کر نسخ کو گلے لگا لیا اور وہاں ساری کتابیں اور رسالے اسی خط میں اور ٹائپ پر طبع ہونے لگے۔ اور ایران کا

تو یہ دستور ہے کہ ہر کتاب اور ہر رسالہ لاکھوں کی تعداد میں چھپتا ہے۔ وہاں ٹائپ نے ایسی مقبولیت حاصل کی اور لیتھوگرافی کو ایسا دیس نکالا ملا کہ کاتب نامی مخلوق ختم ہوئی اور خطاطی کا کام مصوروں نے سنبھال لیا جیسا کہ اب ہندوستان اور پاکستان میں بھی ہو رہا ہے۔

پاکستان قائم ہوتے ہی کچھ باذوق حکام کو خیال آیا کہ یہاں بھی نسخ کو رواج دیا جائے تاکہ ٹائپ میں چھپائی ہو اور پڑھنے لکھنے کا کام خوش اسلوبی سے آگے بڑھے۔

مجھے معلوم نہیں وہ کون تھا جس نے فیصلہ کیا کہ بچوں کی ساری درسی کتابیں نسخ میں کتابت کرائی جائیں۔ اس طرح ایک پوری نسل اس خط کو پڑھنے کی عادی ہو جائے گی جس کے بعد ٹائپ رائج کرنا سہل ہو جائے گا۔

بہت کم لوگوں کو یاد یا معلوم ہوگا کہ قائد اعظم کی تحریک پر شروع ہونے والا انگریزی روزنامہ ڈان شروع شروع میں اردو میں بھی شائع ہوتا تھا۔ یہ اردو ڈان نسخ ٹائپ پر چھپتا تھا۔

ادھر انجمن ترقی اردو کی کوشش سے نسخ ٹائپ کو بہتر بنایا گیا اور انجمن کی کتابیں اسی پر شائع ہونے لگیں۔ لاہور میں ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والوں نے کتاب سازی میں اسی ٹائپ کو رواج دیا۔ ان کا جریدہ 'سویرا' ٹائپ پر چھپا۔ باری کی کتاب 'کمپنی کی حکومت' سے لے کر مجاز کی 'آہنگ' تک کتنی ہی کتابیں نسخ ٹائپ سے آراستہ ہوئیں۔ اور سب سے بڑھ کر لاہور ہی میں مجلسِ ترقیءادب نے کلاسیکی ادب کے سینکڑوں شہ پارے نہایت عمدہ ٹائپ میں شائع کیے۔ غرض یہ کہ یہ سلسلہ چلتا تو رہا مگر ہچکیاں لے لے کر۔

سب سے پہلے اردو ڈان بند ہوا۔ سویرا اپنے خواب دیکھنے والوں کے ارمانوں کے برعکس نہ سرخ ہوا اور نہ سرخ رو۔ مجلس ترقی ادب کا کلاسیکی ادب فٹ پاتھوں پر کوڑیوں کے بھاؤ بکا اور بحیرہ عرب کے ساحل سے لے کر تا بخاک پشاور ہمارا کاتب ہی اپنی کتابت کے ڈنکے بجاتا رہا۔ نستعلیق نے اپنی چولی ہمارے دامن سے ایسی باندھی کہ پھر لاکھ جتن کیے گئے، یہ نہ کھلنی تھی، نہ کھلی۔

اس سلسلے میں آخری ناکام کوشش میر خلیل الرحمان نے کی۔ آفسٹ کی طباعت شروع

ہو چکی تھی۔ کتاب اب پیلے مسطر کی بجائے قدرے شفاف ٹریسنگ کاغذ پر ہونے لگی اور تصویروں کے بلاک کی بجائے طباعت کے لئے ان کی فلمیں بنائی جانے لگیں۔

اُس وقت میر صاحب نے نسخ ٹائپ کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ وہ کہیں سے ٹائپ رائٹر سے ملتی جلتی کمپوزنگ کی ایسی مشین لائے جس میں عبارت کاغذ پر نہیں بلکہ شفاف فلم پر ٹائپ ہو کر نکلتی تھی۔ اس کے بعد کام آسان تھا۔ فلم کو چھاپے خانے میں بھیجا، اس نے پلیٹ بنائی اور تھوڑی ہی دیر میں چھاپ دی۔ مگر میر خلیل الرحمان اپنا پورا اخبار اس ٹائپ پر لاتے ہوئے ڈرے ہوں گے، تو انہوں نے اسے صرف قارئین کے مراسلوں تک محدود رکھا۔ جنگ میں روزانہ مراسلوں کے دو کالم اسی جدید ٹائپ میں طبع ہوتے تھے۔

جب اس طرح کئی مہینے گزر گئے تو اخبار نے اپنے پڑھنے والوں کا ایک سروے کرایا۔ ان سے پوچھا گیا کہ اب بتائیے۔ آپ کو یہ جدید ٹائپ منظور ہے یا نہیں۔

جواب کیا آیا، ایک شور اٹھا 'نہیں'۔

لوگوں نے کہا کہ ہم سے یہ خط جو نسخ کہلاتا ہے پڑھا ہی نہیں جاتا۔ آنکھیں اس کی عادی نہیں اور مطالعے میں دشواری ہوتی ہے۔ ہمیں ہمارا خطِ نستعلیق واپس کیجئے۔

لیجئے صاحب، خط نسخ کی فلم بنانے والی مشین دوبارہ اپنے اصل ڈبوں میں بند کر کے کہیں کسی گودام میں ڈال دی گئی جسے یقین ہے نستعلیق کا زنگ چاٹ گیا ہوگا۔

کتابت کا پرچم ایک بار پھر کراچی کی سمندری ہواؤں میں زور زور سے لہرانے لگا۔ مجھے وہ دن بھی یاد ہیں جب ووٹروں کی فہرستیں چھپنے کا زمانہ آیا۔ سینکڑوں کاتبوں نے گھر جانا چھوڑ دیا۔ انہیں جہاں جگہ ملی انہوں نے تکیہ جما کر ووٹروں کی فہرستوں کی کتابت شروع کر دی۔ رات رات بھر سارے کاتب چائے پیتے اور بیڑیاں پھونکتے رہتے تھے اور فہرستیں لکھا کرتے تھے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ سرکار سے معقول معاوضہ پاتے تھے۔

مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جب روسی مصنف الیکز انڈر سولژے نت سن کی مشہور کتاب 'گولاگ آرکی پے لاگو' ماسکو سے کسی طرح مغرب میں پہنچی، جو اسٹالین کے بیگار کیمپوں میں

ہونے والے مظالم کے بارے میں تھی، امریکیوں کو اس کی کوئی ادا ایسی بھائی کہ انہوں نے راتوں رات اسے دنیا بھر کی زبانوں میں شائع کرانے کی ٹھان لی۔ کرہ ارض کے اطراف میں امریکی سفارت خانے حرکت میں آ گئے۔ انہوں نے کراچی میں ہمارے اخبار کے نیوز ایڈیٹر کو یہ کام سونپا کہ اسے جیسے بھی بنے راتوں رات شائع کرا دو۔ نیوز ایڈیٹر صاحب جس طرح اپنے ماتحت عملے کو ترجمے کے لئے خبریں تقسیم کرتے تھے بالکل اسی طرح 'گولاگ' کے صفحے تقسیم کر دیئے۔ سورج بمشکل دو بار طلوع ہو پایا ہوگا کہ روسی ناول کو اردو کا جامہ پہنا دیا گیا اور اِدھر ترجمہ ہو رہا تھا اُدھر کاتب حضرات ہاتھ کے ہاتھ کتابت کرتے جا رہے تھے۔ یہ 'آناً فاناً' کی ترکیب ایسے ہی موقعوں کے لئے وضع ہوئی ہوگی۔ دیکھتے دیکھتے پاکستان کے کتب فروشوں نے اپنی دکانوں کے نمایاں حصوں میں یہ روسی ناول سجا دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں یہ کتاب مفت ہی تقسیم ہوئی۔ مگر کتابت کے پیشے نے اس چیلنج کو جیسے قبول کیا، نسخ کا فرسودہ ٹائپ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

امریکی سفارت خانے نے 'سیربین' کے نام سے اپنا جریدہ نکالا۔ اس میں بھی کتابت ہی سے کام چلایا گیا۔ امریکہ ہی کے مکتبہ فرینکلن نے اور خدا جانے کس کس نے پاکستان کے اسکولوں کی بعض درسی کتابیں چھاپیں۔ سب کاتب ہی کی مرہون منت تھیں۔ صرف چین اور روس سے چھپ کر جو اردو کتابیں اور رسالے آتے تھے اور آٹھ آٹھ آنے اور دس دس آنے میں فروخت ہوتے تھے وہ سارے کے سارے خط نسخ میں اور ٹائپ میں ہوا کرتے تھے۔ ایسا لگنے لگا تھا کہ دائیں بازو والوں اور بائیں بازو والوں کے درمیان سرد جنگ اس نسخ اور نستعلیق کے سوال پر چھڑی ہوئی ہے۔

کاتبوں کا ایک مسئلہ اور بھی تھا۔ خوش خط تو سارے تھے کہ کھاتے ہی اسی کی تھے لیکن پڑھے لکھے برائے نام تھے۔ میں ان سے کہا کرتا تھا کہ تم لوگ جو کچھ لکھتے ہو اگر اسے سمجھ بھی لو تو دنیا کے بڑے دانشور ٹھہرو۔

اب تصور کیا جا سکتا ہے کہ ایک شخص افلاطون اور ارسطو کا سارا فلسفہ لکھنے کے بعد گھٹنے سیدھے کرنے کے لئے انگڑائی لے کر اٹھے اور اس سے پوچھا جائے کہ ارسطو اور افلاطون کون تھے

تو وہ کہے کہ حکیم تھے، نسخے لکھا کرتے تھے۔

کاتب کو ایک اور کام بھی بخوبی آتا تھا، اور وہ تھا کتابت کے دوران جا بجا غلطیاں کرنا۔ جو شخص شبلی کو ستلی لکھ دے اور کچھ کا کچھ لکھ کر منشی گری کے نام کو بٹہ لگائے اسے کیا کہیے۔ حالت یہ تھی کہ اردو اخباروں میں عملے کو ہدایت کی جاتی تھی کہ اپنے تحریر میں پانچ چھ لفظ ایسے ہیں جو کبھی نہ لکھے جائیں بلکہ ان کے متبادل لکھے جائیں کیونکہ خطرہ یہ ہے کہ کاتب ادبدا کر انہیں غلط لکھے گا۔

قراۃ العین حیدر کی مشہور تحریر کا عنوان ہے: قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے۔ کاتب نے لکھا: قید خانے میں تلاطم ہے کہ نیند آتی ہے۔ اب یہ نہیں کہ اس نے عقل پر زور دیا ہوگا اور کسی استدلال سے کام لے کر عبارت تبدیل کی ہوگی۔ وہ تو لکھنے والی مشین تھا، بس لکھے جاتا تھا۔ اگر عقل پر زور دیتا تو سوچتا کہ 'ہند' مونث کیسے ہو گیا اور پھر لکھتا کہ قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتا ہے۔ خیر۔

ایک بار ایک روزنامے کی شہ سرخی میں ایسی بھیانک غلطی ہوئی کہ بازار سے سارا اخبار واپس منگا کر دوبارہ چھاپنا پڑا۔

منشی گری کے اس نقص کا بس ایک ہی فائدہ تھا اور یہ بھی کاتب کو نہیں بلکہ مصنف کو۔ جہاں کہیں اس سے لکھنے میں کوئی بھول ہوئی، آپ چاہیں تو اسے حماقت بھی کہہ لیجیے، اس نے جھٹ سارا الزام کاتب کے سر ڈالا۔ خود کاتب دبے لفظوں میں شکایت کیا کرتے تھے کہ سارا الزام ہمارے کاندھوں پر ڈال دیا جاتا ہے حالانکہ آپ اصل مسودہ دیکھیں تو حال یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات خود مصنف بھی چشمہ لگا کر اور روشنی کے رخ پر کر کے اپنا ہی لکھا ہوا پڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ خدا جانے کیا لکھا ہے۔

مجھے وہ بھی یاد ہے کہ جب اسٹالن کی بیٹی، جس کا نام سویتلانہ (سویت لانہ) تھا، ماسکو سے امریکہ جا پہنچی اور دنیا بھر کے اخباروں میں اس کی خبریں چھپنی شروع ہوئیں تو اردو اخباروں میں آتے آتے اس کا نام سوتیلانہ (سوتی لانہ) ہو گیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ساری کاتب برادری

اپنی گفتگو میں اسے سوتیلانہ کہتی تھی اور سوتیلانہ ہی لکھتی تھی۔ ایڈیٹروں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا لیکن کاتب ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بالکل یوں لگتا تھا جیسے ساری برادری نے ایکا کر لیا ہے۔ خوب تھا وہ دور بھی۔ کبھی فرصت سے بیٹھ کر اس کا احوال بھی لکھا جائے گا۔

لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ دور ختم ہوا۔ وہ بھیانک خواب ٹوٹا اور رنگ بدل کر ہی سہی، نیا سویرا طلوع ہوا۔

یہ اعزاز بھی اخبار جنگ کے بانی میر خلیل الرحمان کے سر جاتا ہے جنہوں نے مرزا جمیل احمد کا ہاتھ بٹایا۔ مرزا صاحب نے خط نستعلیق میں پوری اردو لغت کمپیوٹر کو ذہن نشین کرا دی اور کمپیوٹر نے اشارہ پا کر اس نستعلیق میں حروف ڈھالنے شروع کر دیئے جسے ہم نوری نستعلیق کے نام سے جانتے ہیں۔

اخبار جنگ ایک روز جو بازار میں آیا تو یوں لگا جیسے پورے اخبار کی کتابت تنہا ایک کاتب نے کی ہے اور کاتب بھی ایسا کہ اس نے جو حرف ایک بار جیسا لکھ دیا، وہ حرف سو بار آیا تو سو مرتبہ ویسا ہی لکھا۔

ستواں، متوازن اور متناسب حروف، صاف ستھرے کش، عمدہ دائرے، لاجواب مرکز، لفظوں کی بے مثال نشست، ہر سطر میں زیادہ حروف کھپائے ہوئے، الفاظ قرینے سے جمائے ہوئے۔ ایسی کتابت کسی نے کب اور کاہے کو دیکھی ہوگی۔

کمپیوٹر کی اس کتابت میں، جیسا کہ ہوتا آیا ہے، شروع میں کچھ عیب تھے اور کچھ عیب اب تک ہیں، مگر وہ ایک ایک کر کے نکالے جا رہے ہیں۔ پہلے سنا ہے یہ کمپیوٹر ایک کمرے کے برابر جگہ لیتا تھا، اب ایک میز کے کونے میں سما جاتا ہے۔ پہلے یہ تھا کہ جو لفظ اس کی یادداشت میں نہیں تھے انہیں خط نسخ میں لکھنے پر مجبور تھا۔ اب ہر پیچیدہ سے پیچیدہ اور اجنبی سے اجنبی لفظ بنا دیتا ہے۔ کچھ برس پہلے میری یہ تحریر کاتب لکھ رہا ہوتا، اب میں اپنے کمرے میں بیٹھا خود لکھ رہا ہوں۔

غرض یہ کہ کاتبوں کی فوج رخصت ہوئی۔ ان ہی میں سے کچھ لوگوں نے کمپیوٹر چلانا سیکھ لیا۔ پھر پڑھے لکھے نوجوان اس میدان میں آئے اور جہاں تیس تیس آدمی بیٹھ کر رات رات

بھر آنکھیں پھوڑا کرتے تھے وہاں اب چند لوگ بیٹھے ہوئے ایک ذرا سا سر کھپاتے ہیں اور باقی کام برقی کمپیوٹر اور اس کا ڈجیٹل دماغ کرتا چلا جاتا ہے۔ کام آسان ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، اس میں رکھ رکھاؤ اور سلیقہ بلا کا آ گیا۔

نوری نستعلیق سے ملتے جلتے خوش نویسی کے کچھ اور نظام بھی وضع ہوئے ہیں مگر ان میں وہ بات نہیں۔ یہ بات انہیں بھی مان لینی چاہیے۔

کمپیوٹر کو اردو خطاطی کیسے سکھائی گئی، یہ ایک الگ موضوع ہے اور اس کی داستان جدا ہے۔ یہ نظام چینیوں سے کس طرح مستعار لیا گیا، اس کے حروف کی کتابت کیسے کی گئی، ان کے جوڑ کیونکر بٹھائے گئے، ان حروف سے شہ سرخیاں کیسے لکھی گئیں، الفاظ ایک دوسرے پر کس طرح چڑھائے گئے اور سات کالم کی عبارت پانچ کالموں میں کیونکر سمائی، یہ سب باتیں کہیں اُور ہونی چاہئیں۔

بس ایک بات اور۔ کاتب کا ایک مرض کمپیوٹر میں وائرس بن کر چلا آیا ہے جس کا ابھی تک کوئی توڑ نہیں نکلا۔

پے در پے غلطیاں کاتب بھی کرتا تھا، پے در پے غلطیاں کمپیوٹر کے کی بورڈ پر بیٹھا ہوا شخص بھی کیے جا رہا ہے۔

اگر اُس سے بھی خدا ہی سمجھا تھا، تو اِس سے بھی خدا ہی سمجھے۔

برطانیہ میں اردو نشریات

برطانیہ میں اردو زبان اسی زمانے میں آگئی تھی جب کمپنی بہادر کے حکامِ بالا بوریوں کے حساب سے دولت لے کر انگلستان واپس آئے اور بڑے بڑے محل خرید کر یا بنوا کر ان میں رہنے لگے۔ Nabob کہلانے والے یہ گورے نواب اپنے ساتھ خانساماں، خدمت گار اور آیائیں برصغیر سے لے کر آئے جن کے ساتھ دو چیزیں برطانیہ پہنچیں۔ شمال کی اردو اور جنوب کا کری پاؤڈر۔

یہ سلسلہ ملکہ وکٹوریہ کی زندگی کے آخری بیس برسوں میں اپنے عروج کو پہنچا اور انہوں نے اپنے مقامی ملازموں اور ملازماؤں کو ایک طرف بٹھا کر سارے کے سارے خدمت گار، بیرے اور اردلی شمالی ہندوستان سے بھرتی کر کے بلا لیے۔ ان ہی میں آگرے کے منشی عبدالکریم بھی تھے جو کھانے کی میز سے جھوٹے برتن اٹھاتے اٹھاتے ملکہ کے منظورِ نظر اتالیق بن گئے اور ملکہ نہ صرف خود ان سے اردو سیکھی بلکہ محل کے تمام اہلِ خانہ، اہل دربار اور خدمت گزاروں کو ایک ایک کتابچہ دے دیا گیا اور ہدایت ہوئی کہ اس کی مدد سے اردو سیکھیں۔

ہم تصور کر سکتے ہیں کہ ان دنوں محل کی راہ داریوں میں صبح وشام اردو زبان سننے میں آتی ہوگی۔ خدمت گاروں میں پھوٹ بھی پڑ گئی تھی اور اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ ممکن ہے محل کے پچھواڑے گالم گلوچ بھی اردو ہی میں ہوتی ہو۔ کیونکہ اس کا جو لطف ہماری زبان میں ہے، انگریزی میں کہاں؟

بیسویں صدی کے شروع میں ملکہ چل بسیں اور ان کے ہندوستانی خدمت گار چلتے کیے گئے۔ اہل درباران سے اور خصوصاً منشی عبدالکریم کے ساتھ ہونے والے شاہی لاڈ پیار سے اتنے نالاں تھے کہ پھر انہوں نے اہلِ ہند کی روک تھام کے لیے ایک بند سا باندھ دیا اور اردو بولنے والوں کی آمد کا سلسلہ برائے نام رہ گیا۔

نو آبادیاتی نظام ختم ہو رہا تھا اور اس بندھے ہوئے بند کے پچھواڑے پانی کا ولولہ جوش مار رہا تھا۔ برصغیر آزاد ہوا۔ انگریز واپس آئے اور پھر ان کے پیچھے ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کا جو ریلا آیا وہ لاکھ جتن کرتے ہیں مگر آج تک رکنے کا نام نہیں لے رہا ہے۔

پانی نشیب کی طرف جاتا ہے۔ وسطی انگلستان کا وہ علاقہ جو مڈ لینڈ کہلاتا ہے ان تارکینِ وطن کے لیے نشیب ثابت ہوا۔ اہل پاکستان لندن جیسا کشادہ شہر چھوڑ کر برمنگھم، بریڈ فورڈ، مانچسٹر، شیفیلڈ اور لیسٹر کے گلی کوچوں کو آباد کرنے لگے۔ غالباً صنعت اور روزگار کی کشش انہیں وہاں لے گئی اور اردو اور پنجابی ان شہروں کی دوسری زبان بن گئی۔ کہتے ہیں کہ وہاں کی سفید فام طوائفیں اپنے رنگ دار گاہکوں کو ان کی زبان میں آوازیں دینے لگیں، پولیس والوں کو ان تارکینِ وطن کی زبان سکھائی گئی اور برمنگھم کے ہر بیت الخلاء میں پہلی بار اردو زبان میں سائن بورڈ لگایا گیا جس پر لکھا تھا ٹوائلٹ کی سیٹ پر کرسی کی طرح بیٹھیں۔

یہ ہدایت اردو میں لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ نو واردانِ انگلستان اسے پڑھیں، سمجھیں اور اس پر عمل بھی کریں۔ لکھنے والے کو ان تینوں باتوں کا ارمان ہی رہا۔

تب شاید کسی نے حکامِ بالا کو سمجھایا کہ ان میں زیادہ تر خواتین اور حضرات پڑھنے کے

ہنر سے نا آشنا ہیں۔ وہ صرف سن سکتے ہیں اور قسمت یاوری کرے تو سنے ہوئے کو سمجھ بھی سکتے ہیں۔

اس وقت کسی کو خیال آیا کہ ان لوگوں کے لیے ریڈیو اور ٹیلی وژن پر پروگرام شروع کیے جائیں تاکہ اس طرح تفریح کے نام پر ان کی اک ذرا سی تربیت بھی ہو جائے۔ سنہ ساٹھ کے عشرے میں بی بی سی برمنگھم نے تارکینِ وطن کے لیے اردو اور ہندی میں وہ پروگرام شروع کیا جس کی یادیں آج بھی تازہ ہیں۔ اس پروگرام کا نام رکھا گیا۔ ''اپنا ہی گھر سمجھیے۔''

تارکینِ وطن پروگرام کے نام کو حکم سمجھ بیٹھے اور اسے گرہ سے باندھنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگائی۔ وہ دن اور آج کا دن، پھر کوئی واپس نہیں گیا۔ لاکھ کوششوں کے باوجود کسی نے انگریزی نہیں سیکھی اور مڈ لینڈ کی بعض دکانوں پر اب تک اردو زبان میں سائن بورڈ لگائے جاتے ہیں۔ کسی پر لکھا ہوتا ہے کہ یہاں لحاف میں ڈورے ڈالے جاتے ہیں اور کہیں تحریر ہے کہ یہاں شلوار کے پائنچے بنائے جاتے ہیں۔

اس دوران یہ ضرور ہوا کہ وہ جو برمنگھم کے ریڈیو اور ٹیلی وژن سے اردو، ہندی پروگرام نشر کرنے کا سلسلہ چلا تھا وہ پھر دوسرے شہروں تک پہنچا اور دیکھتے دیکھتے وسطی انگلستان میں بی بی سی کے مقامی اسٹیشن اردو ہندی پروگرام نشر کرنے لگے۔

یہ تو خیر وہ شہر تھے جہاں تارکینِ وطن بھاری تعداد میں آباد تھے۔ اس طرح کے پروگرام یقیناً مقبول ہوئے ہوں گے لہٰذا دوسرے علاقوں میں بھی اردو ہندی پروگرام نشر ہونے لگے۔ یہ سلسلہ لندن تک پہنچا اور بی بی سی کے مقامی اسٹیشن نے چوبیس گھنٹے کے انگریزی پروگراموں میں سے وقت نکال کر اردو، ہندی اور بنگالی پروگرام شروع کیے۔

مگر پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ رقیبوں نے جا جا کر یہ پروگرام نشر کرنے والوں کے خلاف رپٹ لکھوانی شروع کی اور برصغیر کی مخصوص روایت کے مطابق حکامِ بالا سے کہنا شروع کیا کہ ان لوگوں کو نکالو اور یہی پروگرام ہم سے کراؤ اور یہ کہ ہم تو تم سے پیسے بھی نہیں لیں گے۔

حکام بالا کچھ عرصے تو سنتے رہے آخر وہ بھی تنگ آ گئے۔ اب اس اعلا سطح پر یوں سوچا جانے لگا کہ سنہ اسّی کا عشرہ آ گیا ہے، پرانے تارکینِ وطن اب تک انگریزی سیکھ گئے ہوں گے اور ان کی نئی نسل انگریزوں کی طرح انگریزی بولنے لگی ہے لہٰذا اب ضرورت اس بات کی ہے کہ تارکینِ وطن کے پروگرام ضرور نشر ہوں مگر انگریزی زبان میں ہوں۔

اسّی کے عشرے میں براڈ کاسٹنگ کا رویہ بدلا اور ہندوستانیوں پاکستانیوں کے لیے اردو، ہندی، پنجابی اور بنگالی پروگرام ایک ایک کر کے چپ سادھنے لگے۔

مگر وہ جو سننے والوں کے حلق سے انگریزی اتارنے کی مہم چلی تھی وہ نہ چل سکی اور مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے یا تو اردو ہندی کے یا پھر ملی جلی انگریزی اور ہندوستانی کے پروگرام نشر ہونے لگے اور پھر وہ تبدیلی آئی جسے انقلاب کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اسّی کے عشرے کے خاتمے سے پہلے پہلے ریڈیو اتھارٹی کی منظوری سے ایشیائی تارکینِ وطن کا پہلا ریڈیو اسٹیشن کھلا۔ رات دن چلنے والے اس اسٹیشن کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ یا تو غلط قیاس کی بنا پر ناکام ہو جائے یا تیر نشانے پر بیٹھے اور چاردانگ عالم میں اس کا ڈنکا بجے۔ یہی ہوا۔ اس کا ڈنکا بجا، آج تک بج رہا ہے جس کا شور بلند ہی ہوتا نظر آتا ہے۔

اس کے بعد انگلستان کے کم سے کم چار شہروں میں کمرشل بنیادوں پر تارکینِ وطن کے اپنے نجی ریڈیو اسٹیشن قائم ہوئے اور وہ سب کے سب کامیاب ہی نظر آتے ہیں۔

یہ ایشیائی نشرگاہیں بھی کچھ آسانی سے نہیں کھل گئی تھیں۔ ہوا یہ کہ پہلے تو حکام باضابطہ اجازت دینے سے انکار کرتے رہے۔ وہ کہتے تھے کہ اس طرح کے ریڈیو اسٹیشن چلنے والے نہیں اور اگر آج ہندوستانیوں پاکستانیوں کا ریڈیو اسٹیشن کھلا تو کل دنیا کے کونے کونے سے آئے ہوئے تارکین وطن اپنا استحقاق جتا کر اپنے اپنے اسٹیشن کھولنے کی عرضیاں دینے لگیں گے۔ چنانچہ ہندی اردو والوں کو اجازت نہیں ملی تو انہوں نے تنگ آ کر حکم عدولی کی اور چوری چھپے وہ نشرگاہیں کھولنی شروع کیں جنھیں آپ اردو میں قزاق اور انگریزی میں پائریٹ کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح کی

نشر گاہیں شہر کے مختلف علاقوں میں ٹھکانے بدل بدل کر پروگرام نشر کرنے لگیں اور حکام کے ساتھ ان کی آنکھ مچولی چلتی رہی۔

آخر ان میں سے کسی ایک کو ہارنا تھا۔ حکام ہار گئے اور لندن میں باضابطہ ریڈیو اسٹیشن قائم کرنے کی اجازت مل گئی۔

اسی دوران شہر میں ایک اور نشر گاہ قائم ہوئی جو اردو سمیت کئی زبانوں میں پروگرام نشر کرتی ہے۔ مختلف ہاتھوں سے ہوتا ہوا یہ پروگرام اب ایک صاحبِ حیثیت ادارے کے تصرف میں ہے اور کچھ سر کردہ براڈ کاسٹر وہاں سے دن کے کافی بڑے حصے میں اردو پروگرام نشر کر رہے ہیں۔

یہ دونوں نشر گاہیں اب صَرف Medium Wave کی پابند نہیں اور یورپ اور افریقہ تک سنی جا رہی ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ کسی ایشیائی نشر گاہ کو ایف ایم فریکوئنسی پر پروگرام نشر کرنے کا لائسنس نہیں ملا ہے۔ اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ تمہارے گراموفون ریکارڈوں میں شور بہت ہے جب کہ ایف ایم بہت اعلا قسم کی ریکارڈنگ کے لیے موزوں ہے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ خود پاکستان کے تمام بڑے شہروں میں ایف ایم اسٹیشن کھل رہے ہیں اور وہاں ریکارڈنگ کا سارا کا سارا نظام ڈیجیٹل ہو چکا ہے۔ برصغیر میں اب وہ پرانے ریکارڈ نہیں بنتے جنہیں کبھی توا کہا جاتا تھا۔ اب وہاں ساری ریکارڈنگ سی ڈی پر ہوتی ہے جو کراچی کے بازاروں میں بے حد ارزاں مل جاتے ہیں۔

ڈیجیٹل کی بات آئی تو اب ہماری کہانی اس مرحلے پر پہنچ گئی ہے جہاں نشریات کی دنیا میں جدید ٹیکنالوجی دبے پاؤں آ گئی اور ہوا کی لہروں پر آوازیں اور تصویریں نشر کرنے کا نظام فرسودہ ہونے لگا۔ گلی گلی کیبل بچھائے گئے اور چھتوں پر کھلی چھتریوں جیسے ایریل سر اٹھانے لگے۔ ڈیجیٹل براڈ کاسٹنگ آسان اور ارزاں ہونے لگی اور نئی نشر گاہیں کھولنے کے امکانات بڑھنے لگے۔

اس کے نتیجے میں پہلی بار لندن میں ایشیائی باشندوں کے لیے ایک ٹیلی وژن چینل نے کام شروع کیا۔ جلد ہی اس طرح کے ٹی وی اسٹیشنوں کی تعداد بڑھنے لگی بالآخر کیبل کا قصہ بھی تمام ہوا اور وہی کھلی چھتری جیسے ایریل بہ یک وقت درجنوں اسٹیشنوں کی نشریات سمیٹ کر ٹیلی وژن سیٹ کے پردے اور لاؤڈ اسپیکر سے باہر اگلنے لگے۔

اب صورت حال یہ ہے کہ اس ڈیجیٹل ٹیلی وژن پر قریباً ایک درجن ٹی وی پروگرام اور اتنے ہی ریڈیو پروگرام اردو ہندی میں نشر ہو رہے ہیں۔ اس کاروبار میں ہندوستان اور پاکستان کے نشریاتی ادارے بھی برطانیہ آکر شریک ہو گئے ہیں جن کے وافر وسائل اپنا چمتکار دکھا رہے ہیں اور آج ہم برطانیہ میں اعلا درجے کے وہی پروگرام دیکھ رہے ہیں جو ہمارے اہل وطن اپنے اپنے گھروں میں دیکھتے ہیں۔ تازہ خبر یہ ہے کہ پاکستان میں بھاری وسائل سے قائم ہونے والا ایک ٹی وی چینل اب اپنے علاقے سے نکل کر یورپ تک پھیلنے کے منصوبے بنا رہا ہے۔ امریکا میں اس نے پہلے ہی قدم جما لئے ہیں۔

ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا جب ٹیلی وژن کا پروگرام اپنے اسٹیشن سے زیادہ سے زیادہ سو میل تک دیکھا جا سکتا تھا۔ اب یہ پروگرام کم سے کم آدھے کرۂ ارض کو بہ آسانی اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے۔ خلائی مدار پر گھومتے ہوئے سیارچے اب ریڈیو اور ٹیلی وژن کے پروگراموں کو اس حد سے بھی آگے لے جا رہے ہیں جسے عرفِ عام میں امکان کی حد کہا جاتا ہے۔

کچھ دیر پہلے برطانیہ کی بی بی سی کی علاقائی نشر گاہوں کا ذکر ہو رہا تھا جو اردو ہندی پروگرام نشر کرنے سے گریز کرنے لگی تھیں۔ اب حال یہ ہے کہ مڈلینڈ میں بی بی سی نے ایشین نیٹ ورک قائم کر دیا ہے جو چوبیس گھنٹے پروگرام نشر کرتا ہے اور جو پہلے صرف وسطی انگلستان میں سنا جاتا تھا۔ اب وہ اسکائی ڈیجیٹل کے ذریعے نہ صرف پورے برطانیہ بلکہ یورپ اور افریقہ کے کئی علاقوں تک اپنی نشریات پہنچاتا ہے۔ یہی نہیں، اس نے پہلی بار ایک نئی ایجاد کی دنیا میں قدم رکھا ہے اور اس ایشین نیٹ ورک کے پروگرام سیٹلائٹ ریڈیو پر بھی سنے جا سکتے ہیں۔ اس کے لیے

خاص قسم کے ریڈیو سیٹ درکار ہوتے ہیں جو اپنے سگنل براہ راست سیٹلائٹ سے موصول کرتے ہیں اور اس کی آواز اتنی ہی صاف ہوتی ہے جتنی خود اسٹوڈیو کے اندر۔ اس ریڈیو کا چلن ابھی عام نہیں ہوا ہے لیکن یہ بات کیا کم ہے کہ اس پر ابھی سے اردو اور ہندی کے پروگرام نشر ہونے لگے ہیں۔

اب میں آتا ہوں بی بی سی لندن کی ورلڈ سروس یا عالمی سروس کی طرف جس کی نشریات کو ستر سال پورے ہوئے ہیں اور اس کا جشن منایا جا چکا ہے۔ ہوا یہ کہ جب ریڈیو نے ترقی کی اور صاحبِ حیثیت ملکوں نے اپنی ریڈیائی نشریات کو Short wave کے ذریعے دنیا میں دور دور تک پہنچانا شروع کیا تو انگلستان نے بھی اس راہ میں قدم اٹھایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہم سب کے سورج نے مملکتِ برطانیہ پر غروب ہونا چھوڑ دیا تھا۔ انگریزی داں طبقہ پوری دنیا میں پھیلا ہوا تھا اور صرف گراموفون میں چابی بھر کر اور انگریزی آوازوں کے ریکارڈ سن کر جی بہلایا کرتا تھا۔ آخر ریڈیو ان کی مدد کو پہنچا اور بی بی سی کی عالمی سروس نے دنیا بھر کے لیے انگریزی پروگرام نشر کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔

پھر کرنا خدا کا یہ ہوا کہ دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی۔ کیسا اچھا زمانہ تھا کہ امریکا نے اس وقت تک پر پرزے نہیں نکالے تھے اور گوشہ نشین ہو کر اپنی خیر منایا کرتا تھا۔ البتہ برطانیہ اس میدان میں کود پڑا اور اسلحے کی جنگ ہو یا پروپیگنڈے کا معرکہ، وہ بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ جرمنی اور اس کے اتحادیوں نے دنیا کو اپنا ہم خیال بنانے کے لیے دنیا والوں کی بولیوں میں ریڈیائی پروگرام نشر کرنے شروع کیے۔ برطانیہ کب کسی سے پیچھے رہتا تھا۔ اس نے بھی لندن کے تعلیمی اداروں میں پڑھنے والے دنیا بھر کے لڑکوں اور لڑکیوں کو اکٹھا کیا اور ان کی زبانوں میں ریڈیائی پروپیگنڈا نشر کرنا شروع کیا۔ ان ہی دنوں بی بی سی لندن سے اردو پروگرام شروع ہوئے جن کا یک مقصد اہلِ ہند کو اپنا ہم خیال بنانا اور دوسرا مقصد دنیا بھر کے محاذوں پر برسرِ پیکار ہندوستانی فوجیوں کا دل بڑھانا اور دل بہلانا بھی تھا۔ چنانچہ لندن سے Short wave پر دوسری زبانوں

کے علاوہ وہ پروگرام بھی نشر ہونے لگے جنہیں اس وقت اردو یا ہندی نہیں بلکہ ہندوستانی کہا جاتا تھا۔

انگریز تو چونکہ قاعدے قانون کے بڑے پابند ہوتے ہیں، انہوں نے اپنی عالمی نشریات شروع کرتے ہوئے ایک چارٹر یا منشور بنایا جس میں طے پایا کہ غیر ممالک کے لیے نشر ہونے والے پروگرام غیر ممالک ہی میں سنے جا سکیں گے۔ انہیں برطانیہ کے اندر نشر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس اصول پر اتنی سختی سے عمل کیا گیا کہ جب اردو ہندی بولنے والے لاکھوں مرد وزن آ کر خود برطانیہ کے اندر آباد ہو گئے، اس وقت بھی ان کی اپنی بولیوں میں نشر ہونے والے پروگرام برطانیہ کی حدود کے اندر سننا ناممکن تھا۔ لیکن یہ قانون پسندی رفتہ رفتہ ہٹ دھرمی محسوس ہونے لگی اور جب بی بی سی کی علاقائی نشر گاہوں نے برطانیہ کے اندر تارکینِ وطن کی زبانوں میں پروگرام نشر کرنے شروع کیے تو تاریخ میں پہلی بار عالمی سروس کے اردو، ہندی اور بنگالی پروگرام برطانیہ کے اندر بھی سنے گئے۔ شروع شروع میں لیسٹر کے اسٹیشن کے توسط سے عالمی سروس کے یہ پروگرام اور خصوصاً خبرنامے تقریباً دو درجن علاقائی نشر گاہوں کو بھیجے جانے لگے اور جگہ جگہ سنے جانے لگے۔ اب وسطی انگلستان میں ایشین نیٹ ورک قائم ہو جانے کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ مگر اس دوران جدید ٹیکنالوجی نے یہاں بھی اپنا کمال دکھایا اور بی بی سی کی عالمی سروس کے اردو، ہندی، بنگالی، فارسی اور پشتو پروگرام اب ڈیجیٹل سیٹلائٹ کے توسط سے انگلستان کے اندر اور باہر بھی سنے جانے لگے ہیں اور اس کا سہرہ غالباً افغانستان کے حالات کے سر بندھتا ہے اور اس کا سلسلہ گیارہ ستمبر کے تاریخ ساز واقعات سے ملتا ہے۔

ہر طرف سے بہ یک وقت کام کرنے والے عوامل نے اب ریڈیو اور ٹیلی وژن کی دنیا میں ایک تازہ انقلاب کی نوید سنائی ہے۔ ٹیکنالوجی کے اس میدان میں اب انٹرنیٹ پوری جلوہ آرائی کے ساتھ دھوم مچاتا ہوا آ پہنچا ہے اور ریڈیو تعلیم دینے یا ذہن بنانے اور بدلنے کے جتنے بھی فریضے انجام دیتا ہے ان کو انٹرنیٹ کچھ ایسی مہمیز دینے والا ہے کہ اب یہ سلسلہ کہیں رکنے اور تھمنے والا نہیں۔

یہاں میں بی بی سی کی عالمی نشریات کی صرف اردو سروس کی مثال دینا چاہوں گا۔ درجنوں دوسری زبانوں کی طرح اردو سروس دو شعبوں میں بٹ گئی ہے۔ ایک تو وہی عمر رسیدہ شعبہ یعنی ریڈیو اور دوسرا بالکل جدید کمپیوٹر زدہ شعبہ جسے ''آن لائن'' کا نام دیا گیا ہے۔ یہ شعبہ ہوا میں پھیلنے والی ریڈیائی لہروں کا پابند نہیں۔ یہ دنیا کے کسی خاص علاقے یا خطے کے طرف نشریاتی سگنل بھیجنے کی قید سے بھی آزاد ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں کمپیوٹر ہے اور ٹیلی فون لائن سے جڑا ہوا ہے وہاں پروگرام ڈنکے بجاتے ہوئے پہنچنے لگے ہیں اور وہ بھی اس شان سے کہ دنیا میں جہاں چاہیں اور جس وقت چاہیں اپنی سہولت سے سن لیجیے اور کوئی ادا اچھی لگے تو بار بار سنیے۔ یہی نہیں۔ کوئی ادا طبیعت پر گراں گزرے تو اسی کمپیوٹر کے توسط سے نشرگاہ کے نام جوابا جو جی میں آئے لکھ بھیجئے اور چاہیں تو دل کی بھڑاس نکال لیجیے۔ میں یہ بات بر بنائے قیاس نہیں، بر بنائے تجربہ کہہ رہا ہوں۔

اب یہ مکالمہ یک طرفہ نہیں رہا، دو طرفہ ہو چکا ہے۔

ٹیکنالوجی ترقی کی طرف گامزن ہے۔ ریڈیو اب اپنا سگنل سیٹلائٹ سے موصول کرے گا، انٹرنیٹ ٹیلی فون کنکشن سے بے نیاز ہو کر وائرلیس ہونے والا ہے اور ٹیلی وژن پر بہ یک وقت سیکڑوں چینل آنے والے ہیں۔ یہ سلسلہ رکنے والا نہیں اور آگے کیا ہوگا، پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ۔

ایسے میں اردو ریڈیو اور ٹیلی وژن کے شعبے میں کیسی پیش رفت کی ضرورت ہے، یہ آج کا اہم سوال ہے۔ جہاں تک برطانیہ کا تعلق ہے، کئی نشرگاہوں سے ملی جلی زبانوں میں نہیں بلکہ اردو زبان میں پروگرام نشر ہونے لگے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان نشرگاہوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ مثال کے طور پر زیادہ سے زیادہ زر سالانہ اردو چینلوں کو دیا جائے اور اس طرح نہ صرف ان کے ناظرین اور سامعین کی تعداد بڑھے، ان کے وسائل میں بھی اضافہ ہو اور انہیں ترقی کا موقع ملے۔

دوسری بات جو بہت اہم ہے وہ یہ کہ ساری تو نہیں، چند ایک اردو نشر گاہوں سے بولی جانے والی بگڑی ہوئی اردو زبان کا کچھ کیا جائے۔ لہجہ، تلفظ اور ادائیگی کا معاملہ ایسا نہیں کہ آسانی سے درگزر کر دیا جائے۔ اس بارے میں سامعین اور ناظرین کے ایسے ادارے بنائے جاسکتے ہیں جو پریشر گروپ کے طور پر کام کریں اور ان نشریاتی اداروں کی فروگزاشت پر نگاہ رکھیں اور انہیں ان کی اصلاح کے لیے مشورے دیں۔

یہ مسئلہ صرف برطانیہ ہی کا نہیں، پاکستان کا بھی ہے اور خاصا تشویش ناک ہے، لیکن اس پر گفتگو کا یہ موقع نہیں۔

برطانیہ میں bilingual پروگراموں کے نام پر اردو کے پہلو میں انگریزی کا کانٹا مسلسل چبھتا رہتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس میں نقصان بھی کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب انگریزی بولی جائے تو جی کھول کر بولی جائے لیکن جب اردو بولی جائے تو اسے اردو ہی رہنے دیا جائے۔ اس میں بھی تو کوئی خسارہ نہیں۔

میری ایک بڑی خواہش ہے کہ برطانیہ میں ایک ایسی نشر گاہ قائم کی جائے جسے اعلانیہ اردو ریڈیو اسٹیشن کہا جائے۔ یہ ایک جدید ریڈیو اسٹیشن ہو جو ڈیجیٹل بھی ہو، کمپیوٹر پر بھی ہو اور سیٹلائٹ پر بھی ہو۔ وہاں سے آسان، سہل، سلجھی ہوئی، نکھری ہوئی، شستہ، شائستہ اور کانوں کو بھلی لگنے والی ایسی اردو بولی جائے کہ دل و دماغ میں رس گھولے اور سارے جہاں میں ہو یا نہ ہو، کم سے کم برطانیہ میں دھوم ہماری زباں کی ہو۔

اردو کا قصور

ایک روز ہم چند دوست بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اردو زبان موضوع بحث تھی اور اس سوال پر غور ہو رہا تھا کہ اردو کا مستقبل کیا ہوگا۔ کسی نے کہا کہ وہی ہوگا جو اردو کا سب سے بڑا اخبار چاہے گا، لیکن ایک طرف سے آواز آئی کہ وہی ہوگا جو پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ چاہے گا۔

پھر ایک اور دل چسپ سوال اٹھا۔ رابطے کی زبان کس کو کہتے ہیں۔ بڑی بحث ہوئی جس کی سب سے پر لطف بات یہ تھی کہ سب لوگ ایک ہی بات کہہ رہے تھے اور لگتا تھا کہ جھگڑا ہو رہا ہے۔

آخر ایک صاحب نے فیصلہ سنایا۔ ''میں بتاتا ہوں کہ رابطے کی زبان کس کو کہتے ہیں۔ ملک کے کسی بھی علاقے میں پیاس سے آپ کا دم نکلا جا رہا ہو تو جس زبان میں آپ پانی مانگیں اور وہ مل بھی جائے، بس وہی رابطے کی زبان ہوتی ہے''۔

اس فقرے پر بحث ختم ہوگئی اور احباب دل ہی دل میں شکر ادا کرتے ہوئے اٹھے کہ 'قومی زبان کس کو کہتے ہیں' جیسے حساس عنوان پر مباحثہ نہیں ہوا۔

یوں نہیں تھا کہ ہم اس موضوع کو بھول گئے تھے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہم یہ موضوع چھیڑنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ گریز کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ آدمی چپ سادھ لے۔ ایک خاموشی جتنی بلاؤں کو ٹال سکتی ہے ان کا شمار ممکن نہیں۔

کچھ عرصہ ہوا اسلام آباد میں ملک کی قومی اسمبلی میں گفتگو کے دوران کسی نے اردو کو قومی زبان کہہ دیا۔ اس واقعے کا راوی بھی اردو کا سب سے بڑا اخبار ہی ہے۔ کسی نے باتوں باتوں میں اردو کو پاکستان کی قومی زبان کہہ دیا۔

قریب تھا کہ تلواریں سونت لی جاتیں۔

پاکستان میں قومیت کے سوال پر جذبات کا جو عالم ہے اس پر میری کیفیت دیکھ کر یہی پوچھا جاسکتا ہے کہ اے شخص، تو پہلے ہنسا کیوں اور پھر رویا کیوں؟۔

پاکستان شاید دنیا کا واحد ملک ہے جہاں دو کام نہیں ہوتے۔ بہت سے لوگ ٹیکس نہیں دیتے اور بعض لوگ اپنی قومیت کے خانے میں لفظ 'پاکستانی' خوشی خوشی نہیں بلکہ مجبوراً لکھتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر پاسپورٹ اور ویزا حاصل کرنا ممکن نہیں اور غیر ملکوں کا سفر کئے بغیر آرام بھی نہیں۔

اب چونکہ پاکستانی نام کی کوئی قوم نہیں اس لئے قومی زبان نام کی کوئی زبان بھی نہیں۔ اردو کو قومی زبان کے بجائے رابطے کی زبان بالکل یوں کہتے ہیں جیسے کسی کو خاتون کے بجائے عورت کہہ دیا جائے۔

یہی نہیں۔ اپنی بات کی تشریح کرتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں کہ اردو ہماری زبان نہیں۔ اور اگر پوچھا جائے کہ کس کی زبان ہے تو کہا جاتا ہے کہ دربار کی زبان ہے۔ اشارہ دتی مرحوم کی طرف ہوتا ہے۔

ہمارے ایک دوست یہ بات سن کر کچھ برہم سے ہوئے۔ کہنے لگے کہ اگر آپ پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی، سرائیکی، براہوی، ہندکو، پوٹھوہاری اور تھری کو ایک برتن میں بند کرکے زور زور سے ہلائیں اور پھر برتن الٹ دیں تو اس میں سے اردو نکلے گی۔

دلیل کے سوا انداز ہوتے ہوں گے مگر یہ انداز سب سے جدا ہے۔ ہو نا ہو کسی دربار کا انداز لگتا ہے۔

ہر معاملے میں اگر چہ ہندوستان کی مثال دینا مجھے ناگوار ہے لیکن یہاں ماننا پڑے گا کہ ہندوستانیوں نے زبان کے سلسلے میں اپنا ہی رویہ اختیار کیا۔ وہاں تو زبان کے نام پر گردنیں کٹ جایا کرتی تھیں۔ ملک کے ایک علاقے کو ہندی بیلٹ اس طرح کہا جاتا تھا جیسے اس کی تذلیل مقصود ہو۔ دوسرے علاقے ہندی بیلٹ کے مخالف تھے اور کبھی کبھی محسوس ہوتا تھا کہ علاحدگی کا مطالبہ کرنے لگیں گے۔ مگر ہندی بیلٹ والے بہت سیانے نکلے۔ وہ سر جھکائے اپنا کام کرتے رہے اور منہ سے بولے تو ہندی کے سوا کچھ نہ بولے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کسی کو خبر بھی نہ ہوئی اور سارا ہندوستان ہندی بولنے لگا۔ کشمیر تک میں اردو 'پچھڑ' گئی اور اگر چہ ملک میں جناتی ہندی کا رواج نہیں ہوا مگر فلمی زبان پوری سرزمین پر چھا کر رہی۔ اب کوئی تامل ناڈو میں پیاس سے بے حال ہو رہا ہو یا گجرات میں، پانی مانگے گا تو پانی ہی پائے گا۔ اب کوئی ہندی کو رابطے کی زبان کہے تو اس میں نہ تحقیر کا احساس ہوتا ہے نہ تذلیل کا۔ احساس صرف یہ ہوتا ہے کہ ہندی آئی، اُس نے اپنی سرزمین کو دیکھا اور اُٹھ کر فتح کر لیا۔

اب ایک روپے کے نوٹ پر درجن بھر زبانوں میں ' یک روپیا' جیسی عبارتیں لکھی ہوئی ہیں، وہ بھی خوش، ان کا خدا بھی خوش۔

اس 'یک' پر ہماری گنتی کے بارے میں مزے مزے کی حکایتیں ذہن میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ دنیا کی زیادہ تر زبانوں میں اعداد کی آوازیں بہت ملتی جلتی ہیں۔ ایک کا ace، دو کا duo یا dual تین کا tri وغیرہ وغیرہ۔ لیکن کبھی کبھی حیران ہوتا ہوں کہ ہماری گنتی میں دو کہاں سے آ گیا۔ اصولاً اسے سندھی اور گجراتی کی طرح بے ہونا چاہئے تھا۔ کبھی دو کے بجائے بے ہی رہا ہوگا۔ اسی کی بنیاد پر بارہ، بائیس، بتیس اور بیالیس وغیرہ بنے۔ یہ تبدیلی کب آئی، معلوم نہیں لیکن سوچتا ہوں کہ ہماری گنتی آریاؤں سے چلی یا جس سے بھی چلی، دو کو بے ہی کہتے ہوں گے۔ اسی لئے بے سے bi، بائیسکل، بائیسکوپ اور بائی ویکلی جیسی اصطلاحیں بنیں۔

اب ہم جسے گیارہ کہتے ہیں، ایک کو بنیاد بنایا جائے تو اسے اکیس، اکتیس اور اکتالیس کی طرح اکیارہ ہونا چاہئے تھا۔ اب بھی کچھ لوگ گیارہ کو کچھ اس طرح ادا کرتے ہیں کہ اکیارہ ہی سنائی دیتا ہے۔

گنتی اپنے مقامی رنگ اختیار کرنے میں ہمیشہ آزاد رہی ہے۔ پنجاب میں کچھ اور ہے، بہار میں کچھ اور، دکن میں کچھ اور۔

برصغیر کی آدھی سے زیادہ آبادی کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ اچانک پوچھا جائے تو لوگ اُناسی اور نواسی میں فرق نہیں کر سکتے۔ حیرت ہے کہ وقت نے اور لوگوں نے اس کا کوئی حل نہیں نکالا۔ (اس پر یاد آیا کہ سو میں سے بمشکل تین افراد ملین کو مقامی گنتی میں منتقل کر سکتے ہیں۔)

اردو پر جو برا وقت پڑا ہے اس پر بھی بظاہر کسی کو پریشانی نہیں۔ آزادی کے بعد ایک مرحلہ وہ آیا جب اردو میں عربی فارسی کی آمیزش حد سے زیادہ ہونے لگی۔ ہندی والے ہندی کے ساتھ جو سلوک کر رہے تھے اور اب تک کر رہے ہیں، وہ ان کا مسئلہ ہے، وہ جانیں۔ اردو والوں نے عربی فارسی کے غلبے کو چھوڑ چھاڑ کر اردو میں انگریزی لفظ اس روانی اور بے تکلفی سے داخل کرنے شروع کئے جیسے بعض مخصوص مریضوں کے پیٹ میں دس بڑے بڑے انجکشن لگائے جاتے ہیں۔

ایسی زبان سن کر بعض بزرگ کڑوے گھونٹ پیتے جاتے ہیں اور شاید خود کو بہلانے کے لئے کہتے جاتے ہیں کہ اردو کی شان یہی ہے کہ غیر ملکی زبانوں کے الفاظ اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔

پھر خیال آتا ہے کہ دامن میں آنسو اسی وقت جذب ہوتے ہیں جب دامن خشک ہو۔ لیکن جہاں روزمرہ بولے جانے والے اردو لفظ موجود ہوں وہاں زبان میں انگریزی لفظ ٹھونسنا کہاں کی عقل مندی ہے۔

'ون ٹو ون' مذاکرات اس بے تکلفی سے لکھتے ہیں جیسے ابھی ابھی فرہنگ آصفیہ سے

نکال کر لے آئے ہوں۔ اور تو اور مطالبے کو ڈیمانڈ اور نہریں کھودنے کو کینالیں کھودنا لکھنے لگے ہیں۔ سب سِڈی کے لئے اچھی بھلی اصطلاح 'زرِ تلافی' چل نکلی تھی۔ اُسے دوبارہ سب سڈی بنا دیا۔ یہ محض تین مثالیں ہیں، دوسری تین سو مثالوں کے لئے یہاں نہ صفحوں میں گنجائش ہے نہ آنکھوں میں آنسو۔

کسی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اردو کا مستقبل وہی ہوگا جو بڑا اردو اخبار چاہے گا اور اخبار کو کیا پڑی ہے کہ زبان کو سنوار کر رکھے۔

زبان کا حلیہ بدلنے کا عمل خاموشی سے چلتا ہے۔ ہمارے ایک بزرگ ہیں جو 'سماج دشمن' جیسی تراکیب کے دشمن ہیں، بہت برہم ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہندی لفظ سماج کے ساتھ فارسی لفظ دشمن کیسے لگ سکتا ہے۔ یہ بات اُس ظالم سے پوچھی جائے جس نے شروع شروع میں یہ ترکیب تراشی ہوگی۔ اگر بات پرانی ہوگئی اور اس شخص کا ملنا محال ہے تو 'حکومت مخالف مظاہرے' کا موجد ابھی یہیں کہیں موجود ہوگا اس سے باز پرس کی جائے کہ قواعد کی ٹانگ توڑنے کی یہ کون سی ادا ہے۔

قیامِ امن کے عمل کو اطلاعات کے ذرائع 'امن عمل' کہنے لگے ہیں جسے peace process کی مکھی پر ماری ہوئی مکھی سمجھئے۔ اب کسی کو کیا کہ اٹھے اور اس طرح کی اصطلاح سازی کے بارے میں آواز اٹھائے۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ اس کے خلاف آواز اٹھائے۔

زبان میں ایک اور مسئلہ، جسے کم سے کم میں مسئلہ سمجھتا ہوں، مشکل اور نامانوس لفظ بولنے کا ہے۔ گفتگو میں تو لوگ عام زبان بولتے ہیں، یہ بھی غنیمت ہے۔ لیکن جب لکھتے ہیں تو دوسری طرح کی زبان لکھتے ہیں۔ مثلاً روزمرہ کی بول چال میں لفظ تاہم کبھی ادا نہیں کریں گے لیکن جب لکھنے بیٹھیں گے تو قدم قدم پر تاہم لکھیں گے۔

ایک بزرگ کی کتاب پڑھی۔ بے حد جید عالم تھے۔ لکھا تھا کہ فلاں صاحب کا مزربوم بہترین مزربوم تھا۔ اُس روز سے لغات میں سر کھپا رہا ہوں۔

ایک دینی جماعت نے اپنا پیغام عام لوگوں تک پہنچانے کے لئے اخبارات کے نام

ایک پریس ریلیز جاری کی۔ اس کا متن یوں تھا:

''زندہ اقوام وملل اپنے لئے شعار رکھتی ہیں جوان کی جرات و دلیری اور عزت و حرمت کی پاسبانی اور پاسداری کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔۔۔۔ اسلام کے نزدیک منتہائے غرض و غایت حیات بشر اور معراج کامیابی و سرفرازی زہد و تقویٰ ہے اور شعائر الٰہی عظمت و بلندی کی علامت ہیں۔ اس بنا پر تعظیم شعائر الٰہی نہ صرف لازم ہے بلکہ اسے زہد و تقویٰ کہا گیا ہے۔''

بہت جی چاہا کہ یہاں اپنے قاری کے لئے اس عبارت کی تشریح کر دوں مگر تشریح وہ کرے جس کی سمجھ میں اس کا ایک فقرہ بھی آیا ہو۔

ہمارے ایک ساتھی کا پسندیدہ لفظ 'معتد بہ' تھا۔ کہیں نہ کہیں سے کھینچ تان کر اپنی تحریر میں لے آتے تھے۔ مثلاً وہاں معتد بہ اضافہ ہوا ہے، وہاں معتد بہ کمی ہوئی ہے۔ لیکن غضب یہ کرتے تھے کہ جب ریڈیو پر یہ لفظ ادا کرتے تھے تو معتد بہ کے دو لفظوں کو ملا کر ایک لفظ کی طرح ادا کرتے تھے: مو-تا-دے-باہ۔

عمر میں بڑے تھے اس لئے کبھی کسی نے ٹوکنے کی ہمت نہیں کی۔

یوں بھی میں اکثر حیران ہوتا ہوں کہ بعض لوگ مشکل الفاظ اور پیچیدہ فقرے کیوں لکھتے ہیں۔ شعر میں بھی اور نثر میں بھی۔

مشکل زبان سے غالباً علمیت اور قابلیت کا اظہار ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے، ایک بار جامعہ کراچی کے شعبہء صحافت میں تین دن کا مذاکرہ ہوا، مجھے تینوں دن بولنے کی دعوت دی گئی۔ طالب علموں سے خطاب تھا اور طالب علم بھی وہ جو ابھی عملی صحافت کے مرحلے سے نہیں گزرے تھے۔ چنانچہ دو دن تک میں انہیں مزے مزے کی حکایتیں سنا کر اپنی بات سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ تیسرے دن جب میں تقریر کرنے جا رہا تھا تو ایک صاحب نے میرے قریب آکر چپکے سے کہا کہ آج ذرا علمی تقریر کیجئے گا۔

اب صورت حال یہ ہے کہ جسے علمی تقریر کہا جاتا ہے، میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے اس پر

بھی قدرت حاصل ہے۔ یہ قدرت حاصل ہوئی اس کے بعد ہی میں خود کو سہل اور سلیس زبان لکھنے کا اہل سمجھتا ہوں۔ گفتگو کی زبان سے بہتر، دل نشین اور سب سے بڑھ کر ذہن نشین کوئی دوسری زبان نہیں ہوتی۔ بس یہ ضرور ہے کہ جس طرح مختصر عبارت لکھنے کے لئے بہت وقت درکار ہوتا ہے، اسی طرح آسان زبان لکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

سہل اور سلیس اردو کی بات چلی تو پاکستان کے دور دراز قبائلی علاقے سے آیا ہوا ایک خط مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ بی بی سی سے خبریں سناتے ہوئے مجھے کئی برس ہو چکے تھے کہ ایک قبائلی نوجوان کا خط مجھے موصول ہوا۔ اس میں لکھا تھا، عابدی صاحب، ہمارے علاقے میں تعلیم نہیں ہے۔ اب ہم نوجوان تھوڑا بہت پڑھ لکھ گئے ہیں اور اسی لئے میں آپ کو یہ خط لکھنے کے قابل ہوا ہوں۔ دراصل یہ خط میری والدہ نے لکھوایا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ رضا علی عابدی کو لکھو کہ میں ان پڑھ ہوں اور مجھے اردو زبان نہیں آتی لیکن عابدی صاحب جو خبریں سناتے ہیں وہ میری سمجھ میں آ جاتی ہیں۔

میں نے قبائلی نوجوان کے وہ خط تمغہ بنا کر اپنے سینے پر سجا لیا ہے۔ یوں بھی خط میں جذبات نوجوان کے نہیں، ایک ماں کے ہیں جو میری کمزوری بھی ہے اور میری تقویت بھی۔

ہمارے لکھنے والوں کا ایک اور مسئلہ طول نویسی کا ہے۔

ابھی لندن کے ایک اردو ہفت روزہ میں مضمون چھپا جس کا عنوان تھا: برطانیہ میں اردو تعلیم۔ ہمارا پسندیدہ موضوع ہے، جھٹ پڑھنا شروع کیا۔ مضمون آیاتِ قرآنی سے شروع ہوا۔ فاضل مصنف نے ایک پورا کالم یہ ثابت کرنے میں بھگتا دیا کہ اللہ تعالیٰ نے جان بوجھ کر دنیا میں بھانت بھانت کی زبانیں رائج کی ہیں۔

ہمارے ایک بزرگ دانش ور کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ کسی بھی موضوع پر قلم اٹھائیں، اس کا آغاز ہبوطِ آدم سے کرتے ہیں اور آخر میں کہیں جا کر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ امیر خسرو کب اور کہاں پیدا ہوئے تھے۔

چار چار کالموں میں پھیلے ہوئے مضامین کا پہلا کالم آپ بلا تکلف قلم کی ایک جنبش سے رد کر سکتے ہے۔ مضمون کا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ وقت کی کتنی افراط ہے اور مضمون یا تحریر کا کوئی پیشگی خاکہ بنا کر اس کے اندر اندر اپنے دلائل مکمل کرنے کے احساس کی کتنی قلت ہے۔

اور میرے اس خیال سے تو چند ایک مقالہ نگاروں کے سوا سبھی متفق ہوں گے کہ یہی حال مجالس مذاکرہ میں پڑھے جانے والے مقالوں کا ہے۔ اچھے بھلے معقول، سمجھ دار اور پڑھے لکھے حضرات صفحوں کے حساب سے نہیں، تھان کے حساب سے مقالے لکھ لاتے ہیں اور پانی پیتے جاتے ہیں اور پڑھتے جاتے ہیں۔ سننے والے اکتانے لگتے ہیں اور بیزار ہو کر تالیاں بجانے لگتے ہیں۔ مقرر سمجھتا ہے کہ اسے داد مل رہی ہے چنانچہ آنکھیں صرف قدر کھولتا ہے کہ اپنی عبارت دیکھ سکے۔

ٹورانٹو میں مرثیہ نگاری پر ہونے والے کسی سیمینار کی بڑی شہرت ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کے ایک صاحب نے ڈھائی گھنٹے تک اپنا مقالہ پڑھا۔ اُس روز حاضرین مرثیہ سنے بغیر ہی روئے ہوں گے۔

جو مقررین عین موقع پر طوالت سے بچنے کے لئے پیرا گراف یا صفحات چھوڑ چھوڑ کر مقالہ پڑھتے ہیں وہ اور غضب کرتے ہیں۔ بات کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے اور گفتگو مدلل نہیں رہتی۔

ایک بار لندن کے ایک سیمینار نے طول کھینچا۔ مقررین سے کہا جانے لگا کہ دس منٹ سے زیادہ نہ بولیں۔ اس پر دہلی سے آئے ہوئے ایک مقرر نے احتجاجاً اپنے مقالہ نہیں پڑھا۔ کسی نے نہ تو انہیں منانے کی کوشش کی، نہ ناراض ہو کر چلے جانے پر کوئی شکایت کی۔

اب ایک اور مسئلہ۔

میں زبان کے بارے میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ اس کا املا چھاپے خانے کے ہاتھوں بنتا اور بگڑتا ہے اور اس کا تلفظ ریڈیو اور ٹیلی وژن ہی بناتے یا بگاڑتے ہیں۔ اردو رسم الخط میں نہ ہندی جیسی ماترا کا رواج ہے، نہ قرآن جیسے زیر زبر اور پیش لگانے کا چلن ہے۔ جس طرح لفظ کانوں

میں پڑتے ہیں ، عام لوگ اسی طرح ادا کرتے ہیں۔ بگڑتے بگڑتے آوازیں غلط العام کے دائرے میں داخل ہو کر آزادی کا پروانہ پالیتی ہیں۔ لفظ مرض کو پوری قوم قرض کی طرح ادا کرتی ہے۔ لوگ لفظ غلطی کو بالکل یوں ادا کرتے ہیں جیسے بلتستان والوں کو بلتی کہتے ہیں۔ صرف ہندوستانی فلموں میں ضرور کوئی ہے جو اداکاروں سے غلطی کہلواتا ہے۔ اس میں بھی اُس شخص کا کمال کم، ماتراؤں کا دخل زیادہ ہے۔

میرا نام عابد کی مناسبت سے عابدی ہے۔ اکثر اردو والے ب کے نیچے زیر نہیں لگاتے لیکن سارے ہندی والے مجھے عابدی کہتے ہیں اور اس زیر پر ذرا زیادہ ہی اصرار کرتے ہیں۔ خیر۔ انگلستان آ کر تو غضب ہی ہو گیا، یہاں مسٹر عبیڈی ہو گیا ہوں۔

مغربی دنیا میں آ کر ہم لوگوں کے نام کچھ تو میرے نام کی طرح بگڑے، کچھ نام لوگوں نے خود ہی بگاڑ لئے۔ مقصود میکس ہو گئے اور طاہر بے چارے ٹیری کہلائے۔ مگر داد دینی پڑتی ہے اُس غریب کو جو پاکستان چھوڑ کر آسٹریلیا میں آباد ہوا اور وہاں آنے والے پاکستانی ہائی کمشنر کی شہر کے سرکردہ پاکستانیوں سے ملاقات کرائی گئی تو ہر ایک نے اپنا نام بتا کر اپنا تعارف کرایا۔ جب اُس دکھیا کی باری آئی تو بولا کہ یہ لوگ مجھے آگسٹس کہتے ہیں، یوں میرا نام گھسیٹا ہے۔

انگریزی زبان پر اردو کی چھاپ اُسی روز سے لگ رہی ہے جس روز انگریز نے ہندوستان میں قدم رکھا تھا۔ وہاں پہنچ کر سب سے پہلے تو ان کا پالا جنگل کے ڈکیتوں سے پڑا لہٰذا جنگل اور ڈکیت جیسے لفظ جھٹ انگریزی میں آ گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورے بہادر جس طرح دولت لوٹ کر لائے اسی طرح سے لفظ لوٹ انگریزی میں آ گیا۔ کہتے ہیں کہ ریاست خیر پور میں انہوں نے لوگوں کو ماتم کرتے اور یا حسن، یا حسین کی صدا بلند کرتے دیکھا تو ہابسن جابسن جیسی اصطلاحیں انگریزی میں جگہ پا گئیں۔ کڑھی انگریزی میں کری ہو گئی اور اب تو حال یہ ہے کہ سموسا، تکہ، اور کباب سے بھی آگے بڑھ کر اہل انگلستان قورمہ کھانے لگے ہیں اور روغن جوش کی فرمائش کرنے لگے ہیں۔ پاپڑ کو البتہ پاپڈم کہتے ہیں اور پاپڈم کہتے ہوئے مدراسیوں کی طرح گردن بھی

ہلاتے ہیں۔

ایک بار لاہور میں دانش وردوستوں کی محفل تھی اور دنیا بھر کے موضوعات پر باتیں ہو رہی تھیں۔ان کی لے ذرا مدھم ہوئی تو میں نے اپنا پسندیدہ موضوع چھیڑ دیا۔میں نے کہا کہ اردو میں لٹریچر کو ادب کیوں کہتے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ بہت سے احباب نے اس بارے میں کبھی سوچا نہ تھا۔ادب تو تمیز، تہذیب، سلیقے، قاعدے، قرینے، خوش خلقی، خوش ترتیبی اور احترام کو کہتے ہیں اور مفاہیم کی یہ فہرست یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔

تو بات یہ ہونے لگی کہ اگر ادب کو ان ہی معنوں میں لیا جائے تو ہمارے لٹریچر سے معاشرے کے مطالبے بہت بھاری ہیں اور ہمارا تخلیق ہونے والا ادب ان معنوں پر پورا اترتا بھی ہے یا نہیں۔

لیکن بات کا رخ پھر ادھر مڑ گیا کہ اردو میں ان معنوں میں لفظ ادب کہاں سے آیا ہے۔خیال ایران کی طرف گیا۔وہاں کافی عمر گزارنے والے ایک صاحب نے بتایا کہ ایران میں ادب نہیں، ادبیات کہا جاتا ہے۔اب ذہن عربی کی جانب گیا تو سعودی عرب میں کئی برس گزارنے والے ایک صاحب نے بتایا کہ دنیائے عرب میں ادب، علم کے اُس شعبے کو کہتے ہیں جسے پاکستان میں عمرانیات اور انگریزی میں سوشل سائنسز کہا جاتا ہے۔

اس پر کسی نے برجستہ پوچھا: کیا سعودی عرب میں خدا حافظ کو اللہ حافظ کہا جاتا ہے؟۔ جواب نفی میں ملا۔

ادبیات پر یاد آیا کہ پاکستان میں اکیڈیمی آف لیٹرز کو ادارہ،ادبیات کہا جاتا ہے، یہ ترجمہ جس نے بھی کیا، اُسی طرح ٹھیک کیا جیسے کسی نے قائداعظم کے faith کا ترجمہ یقین محکم کیا ہوگا۔مگر جس ترجمے کے قبول کئے جانے اور رواج پانے کا نہ تو کوئی امکان تھا اور نہ ہونا چاہئے تھا وہ تھا نیشنل لنگویج اتھارٹی کا ترجمہ۔

جس کسی نے کرنسی نوٹوں پر لکھی جانے والی 'عندالطلب' والی عبارت لکھی تھی، اس نے نہیں تو اسی قبیل کے کسی شخص نے نیشنل لنگویج اتھارٹی کا ترجمہ 'مقتدرہ قومی زبان' کیا۔ لفظ اتھارٹی کی جگہ مقتدرہ جیسا گاڑھا لفظ سن کر شروع شروع میں لوگ ہنسے ہوں گے مگر لفظوں کے بھی مقدر ہوا کرتے ہیں۔ اس لفظ نے ایسا رواج پایا کہ اب تو لوگ اس ادارے کا پورا نام بھی نہیں لیتے، صرف مقتدرہ کہہ کر کام چلا لیتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ کام چل بھی جاتا ہے۔ اور تو اور، سنا ہے کہ ادارے میں آنے والی ڈاک پر انگریزی میں پتہ لکھنے والے انگریزی ہی میں لفظ مقتدرہ لکھنے لگے ہیں۔

اس معاملے کا ایک دل چسپ پہلو یہ ہے کہ پورے پاکستان میں جتنے اداروں کے نام کے ساتھ لفظ اتھارٹی لگا ہے، دنیا کسی کو بھی نہ تو مقتدرہ کہتی ہے اور نہ کہنا چاہتی ہے۔ اگر کہیں کسی نے زبردستی کی تو وہی حال ہوگا جو تاج محل کا ہوا۔ دربار نے اس کا نام رکھا تھا: روضہء ممتاز محل'۔ غریب عوام کے منہ سے یہ الفاظ نہ نکل سکے تو انہوں نے اس کا نام 'تاج محل' کر دیا۔ آخر جیت غریبوں کی ہوئی۔

مجھے تو وہ دن یاد رہے گا جب میں دریائے سندھ کے کنارے کنارے اوپر کہیں پہاڑوں میں سفر کر رہا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک چھوٹی سی دکان کے چھوٹے سے دکان دار سے باتیں ہو رہی تھیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس دور دراز علاقے میں تمہاری زندگی کیسی گزرتی ہے۔

گہری سانس بھر کر بولا۔ ''صاحب، یہاں تو زندگی اجیرن ہے۔''

ایک غریب دکان دار کے منہ سے ایسا برمحل اردو لفظ سن کر حیرت سے میری سانس ذرا دیر کو رک گئی۔ میں اٹھا اور اسے گلے سے لگا لیا۔

لاکھ کہتا ہوں مگر کوئی سنتا ہی نہیں۔ اردو محل کی زبان نہیں، دربار کی نہیں، پنجاب اور ہریانہ کی نہیں، گجرات اور دکن کی نہیں، لکھنو اور دلّی کی زبان نہیں۔

اردو غریبوں کی زبان ہے۔

یہی اس کا سب سے بڑا قصور ہے۔

رضا علی عابدی کی کتابیں

ریل کہانی

جہازی بھائی (سفرنامہ)

کتب خانہ

جرنیلی سڑک (سفرنامہ)

شیر دریا

جان صاحب

ملکہ وکٹوریا اور منشی عبدالکریم

اردو کا حال

Rs. 150.00

www.sang-e-meel.com

ISBN 969-35-1725-3

9 799693 517254